سرمایۂ اردو

12

Freebooks.pk

سرمایۂ اُردو

(اُردو لازمی)

بارھویں جماعت کے لیے

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

Freebooks.pk

ریویو شدہ: قومی ریویو کمیٹی وفاقی وزارت تعلیم (شعبہ نصاب) حکومت پاکستان اسلام آباد

جملہ حقوق بحق پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ محفوظ ہیں۔

اس کتاب کا کوئی حصہ نقل یا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اسے ٹیسٹ پیپر،
گائیڈ بکس، خلاصہ جات، نوٹس یا امدادی کتب کی تیاری میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

مؤلفین

☆ ڈاکٹر محمد علی خاں

☆ ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

☆ پروفیسر جعفر بلوچ

مدیر

☆ پروفیسر محمد ظفر الحق چشتی

ناشر: زرقا بک ڈپو لاہور

مطبع: عابد پریس لاہور

تاریخ اشاعت	ایڈیشن	طباعت	تعداد اشاعت	قیمت
اپریل 2010ء	اول	سوم	20,000	[redacted]

Freebooks.pk

فہرست

نثر

نمبر شمار	عنوانات	مصنفین	صفحہ
۱۔	مناقب عمر بن عبدالعزیزؒ	علامہ شبلی نعمانیؒ	1
۲۔	تشکیلِ پاکستان	میاں بشیر احمد	6
۳۔	نواب محسن الملک	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	16
۴۔	محنت پسند خردمند	مولانا محمد حسین آزاد	21
۵۔	اکبری کی حماقتیں	مولوی نذیر احمد	26
۶۔	پہلی فتح	نسیم حجازی	34
۷۔	دستک	مرزا ادیب	38
۸۔	ہوائی	بیگم اختر ریاض الدین	47
۹۔	مولانا ظفر علی خاں	چراغ حسن حسرت	54
۱۰۔	قرطبہ کا قاضی	سید امتیاز علی تاج	59
۱۱۔	مواصلات کے جدید ذرائع	ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن	69
۱۲۔	مولوی نذیر احمد دہلوی	شاہد احمد دہلوی	77
۱۳۔	ایک سفرنامہ، جو کہیں کا بھی نہیں ہے	ابنِ انشا	81
۱۴۔	ایوب عباسی	پروفیسر رشید احمد صدیقی	89

Freebooks.pk

نظمیں

نمبر شمار	عنوانات	شعرا	صفحہ
۱۔	حمد	مولانا ظفر علی خاں	95
۲۔	نعت	حفیظ تائب	97
۳۔	خدا سرسبز رکھے اس چمن کو	اکبر الہ آبادی	99
۴۔	اسلامی مساوات	مولانا الطاف حسین حالی	101
۵۔	سراغِ راہرو	جوش ملیح آبادی	105
۶۔	آدمی	سید ضمیر جعفری	107
۷۔	نوجوان سے خطاب	اُسرار الحق مجاز	109
۸۔	ایک کوہستانی سفر کے دوران میں	مجید امجد	111
۹۔	تغیر	احسان دانش	113
۱۰۔	قطعات	انور مسعود	115

غزلیات

نمبر شمار		شعرا	صفحہ
۱۔	کام مردوں کے جو ہیں، سو وہی کر جاتے ہیں	خواجہ میر درد	117
۲۔	کیا فرق داغ وگل میں، اگر گل میں بُو نہ ہو	خواجہ میر درد	118
۳۔	دنیا میں جب تلک کہ میں اندوہ گیں رہا	غلام ہمدانی مصحفی	120
۴۔	نہ گیا کوئی عدم کو دلِ شاداں لے کر	غلام ہمدانی مصحفی	121
۵۔	بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا	مرزا غالب	124
۶۔	کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو	مرزا غالب	125
۷۔	جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی	علامہ محمد اقبالؒ	127
۸۔	نہ تخت وتاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے	علامہ محمد اقبالؒ	128
۹۔	دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی	ناصر کاظمی	130
۱۰۔	اے ہم سخن! وفا کا تقاضا ہے اب یہی	ناصر کاظمی	131
۱۱۔	اُداسی، بے دلی، آشفتہ حالی میں کمی کب تھی	فراق گورکھپوری	133
۱۲۔	سکوں درکار ہے لیکن سکوں حاصل نہیں ہوتا	تابش دہلوی	134
	فرہنگ		136

Freebooks.pk

علامہ شبلی نعمانیؒ

(۱۸۵۷ء۔۱۹۱۴ء)

مناقبِ عمر بن عبدالعزیزؒ

علامہ ابن جوزی نے جو مشہور محدّث گزرے ہیں، حضرت عمر فاروقؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ کے حالات میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ''سیرت العُمرین'' رکھا تھا۔ ہم نے یہ کتاب مصر میں کتب خانۂ خدیویہ میں دیکھی تھی جس سے ''الفاروق'' کے لیے بہت سے مفید معلومات انتخاب کیے تھے۔ علامہ موصوف نے اس کتاب میں صرف ان باتوں کو لیا ہے جو زیادہ تر ان کے اخلاق اور عدل و انصاف سے واسطہ رکھتی ہیں۔ چنانچہ ہم چند واقعات کو اس موقعے پر نقل کرتے ہیں۔ ان میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے واقعات اور حالات میں سب سے زیادہ جو چیز قابل لحاظ ہے وہ غیر مذہب والوں کے ساتھ ان کا طرزِ عمل ہے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ مذہب کی مجسم تصویر تھے۔ مذہبی حیثیت سے ان کو ''عمرؓ ثانی'' کا لقب دیا گیا ہے۔ اس لیے غیر مذہب والوں کے ساتھ ان کا جو طرزِ عمل تھا وہ ان کی شخصی حالت نہیں بلکہ مذہبِ اسلام کا اصلی طرزِ عمل ہے۔ ان واقعات میں سے ہم ایک واقعے کا ذکر کرتے ہیں۔

ایک دن عمر بن عبدالعزیزؒ مسندِ خلافت پر متمکن تھے۔ ایک عیسائی نے، جو حمص کا رہنے والا تھا، دربار میں آکر یہ شکایت کی کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے بیٹے عباس نے میری زمین پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے عباس کی طرف دیکھا۔ عباس نے کہا، یہ زمین مجھ کو خلیفہ ولید نے بطور جاگیر عنایت کی تھی، چنانچہ اس کی تحریری سند میرے پاس موجود ہے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے عیسائی کی طرف مخاطب ہو کر کہا، تم کیا جواب دیتے ہو؟ اس نے کہا، امیر المومنین! میں خدا کی تحریر (قرآن مجید) کے مطابق فیصلہ چاہتا ہوں۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے عباس کی طرف مخاطب ہو کر کہا، عباس! خدا کی تحریر تیرے باپ (ولید بن عبدالملک) کی تحریر پر مقدّم ہے۔ یہ کہ کر وہ زمین عباس کے قبضے سے نکال کر عیسائی کو دلا دی۔

ان کا ایک اور کارنامہ جو نہایت قابلِ قدر ہے، سلاطینِ بنی اُمیہ کی ناجائز کارروائیوں کا مٹانا تھا۔ سلاطینِ بنی امیہ نے ملک کا بڑا حصہ، جو زمینداری کی حیثیت سے رعایا کے قبضے میں تھا، اپنے خاندان کے ممبروں کو جاگیر میں دے دیا تھا۔ جس طرح سلاطینِ تیموریہ کے زمانے میں بڑے بڑے صوبے شہزادوں کی جاگیر میں دے دیے جاتے تھے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ تختِ خلافت پر بیٹھے تو سب سے پہلے ان کو اس کا خیال ہوا، لیکن ایسا کرنا تمام خاندانِ خلافت کو دشمن بنا لینا تھا۔ تاہم انھوں نے اس کی کچھ پروا نہ کی۔

اوّل اوّل جب انھوں نے یہ ارادہ کیا تو تمام خاندان نے اُمِ عمر کو، جو عمر بن عبدالعزیزؒ کی پھوپھی تھیں، سفیر مقرر کر کے بھیجا۔ انھوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس جا کر کہا کہ تمام خاندان برہم ہے اور مجھ کو ڈر ہے کہ عام بغاوت نہ ہو جائے اور لوگ ہنگامہ نہ کر دیں۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا، میں قیامت کے سوا اور کسی دن سے نہیں ڈرتا۔ وہ مایوس ہو کر چلی آئیں۔

خود عمر بن عبدالعزیزؒ کے قبضے میں بھی اسی قسم کی جاگیریں تھیں جو ان کے خاندان کو بنواُمیّہ کی طرف سے عنایت ہوئی تھیں۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے جب ان جاگیروں کا فیصلہ کرنا چاہا تو بڑے بڑے مذہبی علما یعنی مکحول، میمون بن مہران اور ابو قلابہ کو بلایا اور کہا کہ ان جاگیروں کی نسبت آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟ مکحول نے دب کر جواب دیا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے میمون کی طرف رخ کیا کہ تم خدا لگتی کہو۔ انھوں نے کہا اپنے صاحبزادے عبدالملک کو بُلا لیجیے۔ وہ آئے تو عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا کیوں عبدالملک! اس معاملے میں تمھاری کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا، سب واپس کر دینی چاہییں ورنہ آپ کا شمار بھی اُنھی ظالموں اور غاصبوں میں ہوگا۔

عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے غلام سے، جن کا نام مزاحم تھا اور جن کو وہ بہت مانتے تھے، کہا کہ لوگوں نے جو زمینیں ہم کو دیں، نہ وہ اس کے دینے کے مجاز تھے، نہ ہم کو ان کے لینے کا حق تھا۔ تمھاری کیا رائے ہے؟ مزاحم نے کہا، امیر المومنینؒ! آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کے بال بچے کتنے ہیں یعنی ان کا گزر کیوں کر ہوگا؟ عمر بن عبدالعزیزؒ کے آنسو نکل آئے اور کہا، ان کا مالک خُدا ہے۔ یہ کہ کر گھر میں چلے گئے۔ مزاحم وہاں سے اٹھ کر عبدالملک (فرزندِ عمر بن عبدالعزیزؒ) کے پاس گئے اور کہا، بڑا غضب ہوا چاہتا ہے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ تمام خاندانی جاگیروں سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں لیکن میں نے ان سے کہا کہ اپنی اولاد کا لحاظ کر لیجیے۔ عبدالملک نے کہا، استغفر اللّٰہ! تم نے بہت بُری رائے دی۔ یہ کہ کر عبدالملک عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس گئے۔ وہ اس وقت خوابِ راحت میں تھے۔ پہرے والے نے کہا کہ تم لوگ امیر المومنینؒ پر رحم نہیں کرتے۔ دن بھر میں ایک لحظہ تو ان کو آرام لینے دو۔ عبدالملک نے کہا، تُو جا کر ان سے کہہ تو سہی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کے کانوں میں یہ آواز پڑی۔ عبدالملک کو اندر بلا لیا اور کہا، جانِ پدر! یہ کون سا ملاقات کا وقت ہے؟ انھوں نے واقعہ بیان کیا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا، میں نمازِ ظہر کے بعد منبر پر چڑھ کر اس کا اعلان کر دوں گا۔ عبدالملک نے کہا، اس کا کون ذمہ دار ہے کہ آپ اس وقت تک زندہ رہیں گے۔ غرض اسی وقت عمر بن عبدالعزیزؒ باہر آئے، شہر میں منادی کرا دی گئی کہ لوگ مسجد میں جمع ہوں۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے منبر پر چڑھ کر کہا، صاحبو! میں ان تمام زمینوں کو، جو لوگوں نے ہمارے خاندان کو دی تھیں، واپس کرتا ہوں کیوں کہ دینے والوں کو نہ دینے کا حق تھا، نہ ہم کو لینے کا۔ یہ کہ کر جاگیرات کی جو سندیں تھیں، صندوق سے نکلوائیں اور قینچی سے کتر کتر کر ان کو پھینکنا شروع کیا۔ یہ جاگیریں کچھ یمن میں تھیں، کچھ یمامہ

میں تھیں، چنانچہ سب سے پہلے ان زمینوں سے دست برداری ظاہر کی۔

عمر بن عبدالعزیزؒ کو تمام خاندان میں ابنِ سلیمان سے بہت محبت تھی۔ وہ اپنی جاگیر کی سند لے کر آئے کہ میری زمین آپ کیوں چھینتے ہیں؟ فرمایا کہ پہلے یہ زمین کس کے قبضے میں تھی؟ بولے کہ حجاج کے۔ فرمایا تو حجاج کی اولاد کا حق ہے تم کون ہوتے ہو؟ ابن سلیمان نے کہا، اصل میں یہ زمین عام مسلمانوں کی تھی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا تو عام مسلمانوں کو ملنی چاہیے۔ ابنِ سلیمان رونے لگے۔ مزاحم نے کہا امیر المومنین! آپ ابن سلیمان کے ساتھ یہ برتاؤ کرتے ہیں! فرمایا، ہاں میں ابنِ سلیمان کو اپنے بیٹے کے برابر چاہتا ہوں لیکن میں خود اپنے نفس کے ساتھ یہی برتاؤ کرتا ہوں۔

بنو امیّہ کے دفترِ اعمال میں سب سے زیادہ قوم کو برباد کرنے والا یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے آزادی اور حق گوئی کا استیصال کر دیا تھا۔ عبدالملک نے تخت پر بیٹھ کر حکم دیا تھا کہ کوئی شخص میری کسی بات پر روک ٹوک نہ کرنے پائے اور جو شخص ایسا کرے گا سزا پائے گا، اگرچہ اس پر بھی آزادی پسند عرب کی زبانیں بند نہ ہوئیں تاہم بہت کچھ فرق آ گیا تھا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس بدعت کو بالکل مٹا دیا۔ دو نہایت متدیّن اور راست باز شخص اس کام پر مقرر کیے کہ عدالت کے وقت ان کے پاس موجود رہیں اور ان سے جو غلطی سرزد ہو فوراً ٹوک دیں۔ ان کے اس طرزِ عمل سے لوگوں کو عام طور پر جرأت ہوگئی تھی اور لوگ نہایت بے باکی سے ان کے اقوال وافعال پر نکتہ چینی کرتے تھے۔

محدّث ابنِ جوزی نے بہ سند یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ مسلمہ بن عبدالملک جو خاندانِ بنی اُمیّہ کا دست و بازو تھا، نے ایک گرجا کے متولّیوں کے مقابلے میں دعویٰ دائر کیا۔ فریق مقدمہ جو عیسائی تھے، اجلاس میں حسبِ قاعدہ کھڑے تھے لیکن مسلمہ کو چونکہ خاندانی زعم تھا اس لیے بیٹھ کر گفتگو کرتا تھا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا، تمھارا فریقِ مقدمہ کھڑا ہے اس لیے تم بیٹھ نہیں سکتے، تم بھی اس کے برابر کھڑے ہو جاؤ یا کسی اور کو مقرر کرو جو تمھاری طرف سے مقدمے کی پیروی کرے۔ مقدمے کا فیصلہ بھی مسلمہ کے خلاف کیا یعنی زمین متنازعہ گرجا کے متولّیوں کو دلا دی۔

عمر بن عبدالعزیزؒ اکثر عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاں مہمان ہوتے تھے لیکن ان کے کھانے کی قیمت دے دیا کرتے تھے۔ وفات کے وقت اپنے مقبرے کے لیے جو زمین پسند کی وہ ایک عیسائی کی تھی۔ اس کو بلا کر خریدنا چاہا۔ اس نے کہا، امیر المومنین! قیمت کی ضرورت نہیں، ہمارے لیے تو یہ امر برکت کا باعث ہوگا لیکن انھوں نے نہ مانا اور تیس دینار دے کر وہ زمین خرید لی۔

عمر بن عبدالعزیزؒ کی حکومت و سلطنت کا اصلِ اصول مساوات اور جمہوریت تھا۔ یعنی یہ کہ تمام لوگ یکساں حقوق رکھتے ہیں اور بادشاہ کو کسی پر کسی قسم کی ترجیح حاصل نہیں۔ صرف ملکی امور میں نہیں بلکہ معاشرت اور ذاتی زندگی میں بھی عمر بن عبدالعزیزؒ اس کا لحاظ رکھتے تھے۔ ان کے کھانے کا یہ طریقہ تھا کہ عام مسلمانوں کے لیے جو لنگر خانہ تھا

اس میں ایک درہم روز بھیج دیا کرتے تھے اور وہیں جا کر عام مسلمانوں کے ساتھ کھا لیتے تھے۔

ایک دفعہ رات کے وقت مسجد میں گئے۔ ایک شخص مسجد کے صحن میں لیٹا ہوا تھا۔ اتفاق سے عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاؤں کی ٹھوکر اس کو لگی۔ اس نے جھلا کر کہا، کیا تو پاگل ہے؟ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا کہ نہیں۔ پولیس کے آدمی موجود تھے۔ انھوں نے اس شخص کو گستاخی کی سزا دینی چاہی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا، کیوں اس نے کیا گناہ کیا ہے؟ اس نے تو صرف استفسار کیا تھا کیا تم پاگل ہو؟ میں نے کہہ دیا، نہیں۔

عمر بن عبدالعزیزؒ جب مرنے لگے تو مسلمہ بن عبدالملک نے کہا کہ وصیّت کر جائیے۔ کہا میرے پاس کیا ہے جس کی وصیّت کروں۔ مسلمہ نے کہا: میں ابھی لاکھ دینار بھیجے دیتا ہوں جس کو چاہیں اس میں سے وصیّت کیجیے۔ فرمایا کہ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ یہ رقم جن لوگوں سے وصول کی ہے ان کو واپس دے دو۔ مسلمہ یہ سن کر بے اختیار رو پڑے۔

اس سلسلے میں یہ امر بیان کرنے کے قابل ہے کہ خلفائے بنی اُمیّہ کی دولت مندی کا یہ حال تھا کہ جب ہشام بن عبدالملک نے وفات پائی تو اس کے ترکے میں سے صرف اولادِ ذکور کو جس قدر نقدی رقم وراثت میں ملی اس کی تعداد ایک کروڑ دس لاکھ دینار تھی۔ لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ نے جب وفات پائی تو کل سترہ دینار چھوڑے، جن میں سے تجہیز و تکفین کے مصارف ادا کرنے کے بعد دس دینار بچے جو ورثا پر تقسیم ہوئے۔ غرض عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت اور سلطنت ٹھیک اسی اصول کا نمونہ تھی جو اسلام نے قائم کیا تھا۔

(مقالاتِ شبلی، جلد چہارم)

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کیجیے (جواب تین سطروں سے زیادہ نہ ہو):

الف۔ ”مذہبی حیثیت سے اُن کو 'عمرِ ثانیؒ' کا لقب دیا گیا ہے۔“

ب۔ ”ان کا ایک اور کارنامہ جو نہایت قابلِ قدر ہے، سلاطینِ بنی امیہ کی ناجائز کارروائیوں کا مٹانا تھا۔“

ج۔ ”لوگ نہایت بے باکی سے ان کے اقوال و افعال پر نکتہ چینی کرتے تھے۔“

د۔ ”عمر بن عبدالعزیزؒ کی حکومت و سلطنت کا اصلِ اصول مساوات اور جمہوریت تھا۔“

۲۔ درج ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

خدا لگتی کہنا، دست بردار ہونا، روک ٹوک کرنا،

زبان بند ہونا، نکتہ چینی کرنا، دست و بازو ہونا

۳۔ سبق کے حوالے سے درست لفظ کی مدد سے خالی جگہ پُر کیجیے:

الف۔ عمر بن عبدالعزیزؒ مذہب کی ----- تھے۔

(عملی تصویر، مجسّم تصویر، مکمل تصویر)

ب۔ دو نہایت ----- شخص اس کام پر مقرر کیے۔

(متدیّن اور راست باز، نیک اور پارسا، پڑھے لکھے)

ج۔ امیر المومنین! میں خدا کی تحریر ------ کے مطابق فیصلہ چاہتا ہوں۔

(انجیل، توریت، قرآن مجید)

د۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے جب وفات پائی تو کل ------ دینار چھوڑے۔

(سترہ، ستر، سترہ ہزار)

ہ۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا، میں قیامت کے سوا اور کسی ------ سے نہیں ڈرتا۔

(دن، شخص، بات)

۴۔ سیاق و سباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل اقتباسات کی تشریح کیجیے:

الف۔ ان کا ایک اور کارنامہ ------------- اس کی کچھ پروا نہ تھی۔

ب۔ بنو امیہ کے دفترِ اعمال میں ------------ نکتہ چینی کرتے تھے۔

ج۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کی حکومت ------------ عام مسلمانوں کے ساتھ کھا لیتے تھے۔

☆☆☆☆☆

میاں بشیر احمد
(۱۸۹۳ء۔۱۹۷۱ء)

تشکیلِ پاکستان

ہندوستان میں اسلامی حکومت اگرچہ کہنے کو اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے ڈیڑھ سو سال بعد تک قائم رہی لیکن دراصل حکومت اور امرا دونوں کی طاقت اور سطوت اٹھارھویں صدی کے وسط تک ختم ہو چکی تھی۔ انیسویں صدی کے شروع میں مسلمانوں کے سیاسی تنزّل کی تکمیل ہوئی، چنانچہ ۱۸۰۳ء میں انگریز دہلی میں داخل ہوئے۔ لیکن اسی زمانے میں بعض افراد کے دل میں مذہبی احیا اور معاشرتی اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ شاہ ولی اللّٰہ، شاہ عبدالعزیز وغیرہ کی کوششوں سے علم دوست لوگوں میں مذہب کی صحیح واقفیت بڑھتی گئی لیکن عوام کی مذہبی حالت بہت گری ہوئی تھی اور مذموم معاشرتی رسموں میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں زیادہ فرق نہ تھا۔

سیاسی تنزّل اور معاشرتی تخریب کے اس نازک وقت میں ایک پُرخلوص مصلح سید احمد بریلویؒ پیدا ہوئے جنھوں نے ۱۸۱۶ء سے ۱۸۳۱ء تک پندرہ سال مسلمانوں کی مذہبی و معاشرتی خرابیوں کو دور کرنے کی پوری کوشش کی۔ اسی سلسلے میں مذہبی آزادی کے حصول کے لیے انھوں نے ۱۸۲۶ء میں سکھوں کے خلاف مذہبی جہاد کی مہم بھی شروع کی جس کے آخر میں سات ہزار مجاہدین نے پشاور کے قریب میدانِ جنگ میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور سید احمدؒ نے ایک نظام حکومت قائم کر کے قبائل کی معاشرتی اصلاح کے احکام نافذ کیے لیکن بعض سرداروں کی غدّاری سے، جو سکھوں کے ساتھ شریک ہو گئے آخر کار مسلمانوں کو شکست ہوئی اور ان کا رہنما ۶ رمئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں شہید ہوا یعنی مسلمانوں کی مساعی خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں برباد ہو گئیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سید احمد بریلویؒ نے بار بار ہندوستان کے مسلمانوں کو دوسری قوموں کے مقابلے میں جمع کیا اور ان کے اصلاحی کام کو ان کے بعض مذہبی جانشینوں نے جاری رکھا۔ سرسید بعض باتوں میں اپنے ہم نام کے ہم خیال تھے اور ان کے عقیدت مند تھے۔ اس زمانے میں بہار میں مسلمانوں میں فرائضی تحریک اٹھی جس کا مقصد غریب مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت کی اصلاح اور ان کی امداد تھا۔

۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی رہی سہی عزت بھی خاک میں مل گئی۔ انگریزی حکومت سو سال سے ان کی ذلت کے در پے تھی۔ بتدریج مسلمانوں کی زمینیں اور عہدے چھین لیے گئے، اسلامی تعلیم کے ذرائع ختم کر دیے گئے اور ۱۸۳۷ء میں فارسی زبان عدالتوں سے خارج کر دی گئی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ان پر عتاب اور دباؤ بڑھتا گیا۔ اس طرح مسلمان پسپا بھی ہوئے اور ان مظالم سے متاثر ہو کر نئی حکومت اور اس کے اداروں سے بیزار بھی ہوتے گئے۔ اُدھر ہندوؤں کی

Freebooks.pk

بے رُخی نے اُن کے زخموں پر اور بھی نمک چھڑکا۔ اس نا گفتہ بہ حالت میں ایک دور اندیش ہمدردِ ملّت اٹھا جس نے اپنی مایوس اور پسماندہ قوم کو امید، محنت اور ترقی کا زندگی بخش پیغام دیا۔ یہ مردِ خدا سر سید احمد خاں تھے۔ یہ انھیں کی جدو جہد کا نتیجہ تھا کہ گو ''مُلک ہاتھوں سے گیا، ملّت کی آنکھیں کھل گئیں۔''

سر سید نے قدامت پسند مسلمانوں کو نئے زمانے کی ضروریات سے آگاہ کیا اور ہزار دقتوں سے ان کو نئے علوم کے حصّول اور نئی حکومت سے تعاون پر آمادہ کیا۔ اپنی مذہبی تصانیف اور رسالہ ''تہذیبُ الاخلاق'' کے اجرا سے انھوں نے ثابت کر دکھایا کہ اسلام عقل کے اصولوں پر مبنی ہے۔ اُن کی تعلیمی مساعی ۱۸۷۷ء میں تکمیل کو پہنچیں جب علی گڑھ کالج کا افتتاح ہوا جو کم از کم تیس برس تک مسلمانانِ ہند کا واحد قومی مرکز بنا رہا۔ ۱۸۸۴ء میں سر سید نے پنجاب کا دورہ کیا، جہاں ''زندہ دلان پنجاب'' کی قدر دانی سے ان کو بڑی تقویت پہنچی۔ پنجاب کے مسلمان ''سر سید کی منادی پر اس طرح دوڑے جس طرح پیاسا پانی پر دوڑتا ہے۔'' ایک طرف وہ علی گڑھ سے وابستہ ہوئے دوسری طرف انھوں نے لاہور میں انجمنِ حمایتِ اسلام کا ادارہ قائم کیا۔ ۱۸۸۶ء میں سر سید نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی جس کے اجلاس ہر سال مختلف مقامات پر منعقد ہو کر مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پھونکنے کا باعث ہوئے۔ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اردو کو موقوف کر کے ملک میں بھاشا زبان رائج کی جائے۔ سر سید کہتے تھے: ''یہ پہلا موقع تھا جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا محال ہے اور دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔''

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس کی بنا پڑی۔ سر سید نے مسلمانوں کو اس میں شرکت کرنے سے روکا کیونکہ ان کی دور اندیشی نے دیکھ لیا کہ اس سے مسلمانوں کو بحیثیتِ قوم نقصان پہنچے گا۔ اپنے ایک اہم بیان میں انھوں نے کہا کہ جمہوری طریقہ ہندوستان کے لیے موزوں نہیں۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ سر سید کے پیشِ نظر انگریزوں کی خوشنودی نہ تھی بلکہ اپنی قوم کی ترقی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے اپنی مشہور تصنیف ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' لکھ کر حکومت کو توجہ دلائی کہ غدر کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو ملک کی سیاسی کونسلوں میں شامل نہ کیا گیا۔ پھر ۱۸۷۸ء میں جب وہ کونسل کے ممبر نامزد ہوئے تو انھوں نے ملکی اور قومی مفاد پر پے در پے تقریریں کیں۔ ۱۸۹۸ء میں جب سر سید نے انتقال کیا تو ان کی قوم اپنے خوابِ گراں سے جاگ چکی تھی۔

سر سید کے بعد اُن کے رفقا نے ان کا شاندار کام جاری رکھا۔ محسن الملک، وقار الملک، حالی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، شبلی وغیرہ نے تعلیمی، سیاسی اور ادبی خدمات سر انجام دیں۔ محسن الملک نے علی گڑھ کالج کو ترقی دی۔ وقار الملک ایک سیاسی جماعت کی تشکیل میں معاون ہوئے۔ حالی کی مسدّس نے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں انقلاب کی لہر دوڑا دی۔ شبلی

نے اسلامی تاریخ کے آئینے میں انھیں اپنی گذشتہ عظمت دکھا کر ان کے دلوں کو گرما دیا۔ امیر علی نے اپنی انگریزی تصانیف سے مغربی حلقوں میں اسلام کی وقعت پیدا کی۔

علی گڑھ تحریک کی وجہ سے قوم میں کئی اور تحریکات شروع ہوگئیں۔ اختلافات ضرور رونما ہوئے لیکن ایک حد تک یہ نئی زندگی کا نشان تھے۔ سرسید، امیر علی اور دیگر بزرگوں نے اسلام کو مغربی علوم سے اس طرح جاملایا تھا کہ اسے ایک ترقی یافتہ مذہب ثابت کیا لیکن اس جدید علم الکلام کے ردِعمل کے طور پر بعض اور مذہبی مساعی بروئے کار آئیں۔

شبلی نے لکھنؤ میں ندوۃ العلما قائم کیا۔ دیو بند میں علما نے قدیم طرز کی درس گاہ بنا کر ملک میں قدیم اسلامی علوم کے چراغ روشن کیے۔

ان مساعی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب سے بیگانگی بہت حد تک کم ہوگئی اور مغرب کی ذہنی غلامی سے نجات ملی لیکن ساتھ ہی ایک ایسی فضا بھی پیدا ہوگئی جس میں اپنی ہر چیز اچھی اور دوسروں کی ہر چیز بری نظر آنے لگی۔ اس کی اصلاح ضروری ہوگئی۔

اقبالؒ نے آ کر اسلامی و مغربی علوم کے غائر مطالعے کے بعد اپنا خاص اسلامی فلسفہ قوم کے سامنے پیش کیا، جس کا مقصد کامل ترین انسان کی انفرادی واجتماعی نشوونما ہے۔ اقبالؒ کا خیال ہے کہ انسان اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابت الٰہی کی تین منزلیں طے کرتا ہوا خودی کی انتہائی بلندی پر پہنچ سکتا ہے۔ اس ارتقا میں اسے مذہب کی رہنمائی درکار ہے۔

اقبالؒ نے چار چیزوں پر زور دیا: اوّل توحید، جس پر پورا ایمان عملاً انسان کو خوف و مایوسی سے آزاد کر دیتا ہے نیز توحید الٰہی، توحید انسانی میں پرتوفگن ہوتی ہے۔ دوم، رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے محبت اوران کی مکمل تقلید۔ سوم، قرآن کا مطالعہ اوراس کی تعلیمات کی پیروی۔ چہارم، رجائیت یعنی مایوسی اور غم پسندی کو ترک کر کے امید، ہمت اور جرأت کی راہ اختیار کرنا، اقبالؒ نے سچے مومن کی یوں تعریف کی ہے:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان
قہّاری و غفاری و قدّوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اقبالؒ نے اپنی قوم کو یہ کہہ کر جگایا اور اکسایا کہ:

چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

اپنے رہنماؤں کی پکار سن کر مسلمان قوم ترقی کی راہ پر کچھ چلنے تو لگی لیکن جا بجا ٹھوکریں کھاتے ہوئے۔ معاشی حیثیت سے وہ اپنے ہمسایوں سے کہیں پیچھے رہی۔ تعلیمی حیثیت سے وہ ضرور کچھ بڑھی لیکن پھر بھی پسماندہ رہی البتہ اپنی قومی زبان وادب کو اس نے باوجود اپنے انحطاط کے خوب چمکایا۔ اردو علم وادب اور صحافت کو ترقی ہوئی اور ملک میں جا بجا اردو کی علمی وادبی انجمنیں پھیل گئیں۔ علی گڑھ کالج ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی کے درجے تک پہنچ گیا اور منجملہ حیدر آباد (دکن) کی دوسری ترقیات کے وہاں جامعہ عثمانیہ کا شاندار ادارہ قائم ہوا۔ متمدّن زندگی کے اکثر شعبوں میں مسلمان دوسروں سے پیچھے ضرور تھے لیکن یہ بات اب ان پر اور دوسروں پر ظاہر ہوگئی کہ جب بھی اور جہاں بھی وہ بڑھنے کی کوشش کریں وہ دوسروں سے ہیٹے نہیں رہتے۔ البتہ باوجود ان سب ترقیوں کے یہ امر اظہر من الشّمس تھا کہ جب تک قوم سیاسی حیثیت سے مضبوط ومتحد نہ ہوگی اس کی ساری روایات اکارت جائیں گی اور اس کے سارے ارادے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔

مسلمانانِ ہند کی جدید سیاسی زندگی کی داستان یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس کے قیام کے بعد گو سرسید نے علی گڑھ میں مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے قدم اٹھایا لیکن بالعموم ان کی قومی سیاست یہی تھی کہ مسلمان ملکی سیاست سے الگ تھلگ رہیں اور پہلے مغربی علوم کے حصول سے اپنی قوم کی حالت کو درست اور مضبوط کرلیں مگر بیسویں صدی کے شروع سے ایشیا اور اس کے ساتھ ہندوستان میں صورتِ حال دگرگوں ہونے لگی۔ جاپان کی فتح سے ہندوؤں میں جذبۂ قومیت ابھرا اور انھوں نے تقسیمِ بنگال کے خلاف ۱۹۰۵ء میں ایک زبردست تحریک شروع کی۔ علاوہ ازیں اُردو ہندی جھگڑے کے سلسلے میں یوپی کی حکومت نے علی گڑھ کے تعلیمی ادارے کو اس نیم سیاسی مسئلے میں دخل دینے سے حکماً روک دیا، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے اور بھی ضروری ہوگیا کہ وہ اپنے تمدنی وسیاسی حقوق کی حفاظت کے لیے ایک سیاسی جماعت کی بنیاد رکھیں۔ یوں (دسمبر ۱۹۰۶ء میں) مسلم لیگ قائم ہوئی اور ۱۹۰۹ء کی اصلاحات میں مسلمانوں نے جداگانہ انتخابات کا اہم حق حاصل کیا۔ پھر تقسیمِ بنگال کی تنسیخ (۱۹۱۱ء) اور جنگِ بلقان وطرابلس (۱۹۱۲ء) سے جب مسلمانوں کو یقین ہوگیا کہ ان کے قومی اور بین الاقوامی حقوق حکومتِ برطانیہ کے ہاتھ میں محفوظ نہیں رہ سکتے تو انھوں نے ہندوستان کے لیے ''سیلف گورنمنٹ'' کا مطالبہ کیا (۱۹۱۳ء) اور کانگرس کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھایا۔

جنگِ عظیم اوّل نے ہندوستانیوں کے دل میں حرکت پیدا کی اور کانگرس اور لیگ میں ''میثاقِ لکھنؤ'' کا مشہور

معاہدہ ہوا جس کی وجہ سے برطانیہ ۲۰/اگست ۱۹۱۷ء کو یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گیا کہ ہندوستان کو بتدریج خود اختیاری حکومت دی جائے گی، لیکن جنگ کا ختم ہونا تھا کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان سے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں اور ظالمانہ قوانین نافذ کرنے کی ٹھان لی (۱۹۱۹ء) اور ادھر یورپ میں ترکی کے حصے بخرے کرنے کی سازش کی۔ اس پر گاندھی نے علی برادران کی مدد سے عدم تعاون کی زبردست تحریک شروع کی (۱۹۲۰ء) لیکن اس تحریک کا ختم ہونا تھا کہ دوسرے ہندو لیڈروں نے شُدھی اور سنگھٹن کی اشتعال انگیز کارروائیوں سے ہندو مسلم تعلقات کو قطعاً خراب کر دیا۔ اس زمانے میں مسلمان لیڈر غفلت کی نیند سوئے رہے لیکن سائمن کمیشن کی آمد اور نہرو رپورٹ کی مسلم کُش تجاویز پر وہ اپنے خواب سے چونکے (۱۹۲۸ء) اور آل انڈیا مسلم کانفرنس میں جمع ہو کر انھوں نے ایک متحدہ سیاسی مطالبہ جو مسٹر جناح کے چودہ نکات سے مطابقت رکھتا تھا، دنیا کے سامنے پیش کیا (۱۹۲۹ء) اُدھر کانگرس نے گاندھی کی قیادت میں مکمل آزادی کا اعلان کر کے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی (۱۹۳۰ء) اس دوران میں لندن میں گول میز کانفرنس کا انعقاد ہوا (۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۲ء) اور برطانوی حکومت نے اپنا فرقہ وارانہ فیصلہ سنایا لیکن ہندو لیڈروں کی ہٹ دھرمی کے باعث ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی سمجھوتا نہ ہو سکا۔ ۱۹۳۵ء میں نیا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نافذ ہوا جس کی رو سے مرکز میں فیڈریشن اور صوبوں میں خود اختیاری حکومت کا نفاذ طے پایا۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد کانگرس پہلے چھے اور پھر دو اور صوبوں میں حکومت کرنے لگی، جس سے اس کا سر پھر گیا اور اس نے مسلم لیگ سے منہ پھیر کر مسلمانوں کو بحیثیت قوم کے ملیا میٹ کرنے کا مصمّم ارادہ کر لیا۔ چنانچہ کانگرسی حکومتوں نے اردو کو مٹایا، ہندی کو ابھارا اور ہندوانہ تمدن کے دیگر اِداروں اور نشانات کو فروغ دے کر ہندوستانی مسلمانوں کی جداگانہ ہستی کو ہندوؤں میں مدغم کرنے میں بیسیوں علانیہ و خفیہ مساعی کیں۔

یہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک بے حد نازک وقت تھا۔ مسلمانوں میں کہنے کو کئی سیاسی جماعتیں تھیں۔ مسلم لیگ جو ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئی، کبھی جاگتی کبھی سوتی رہی اس کے بعد ۱۹۱۹ء کے ہنگامہ خیز سال میں جمعیۃ العلما بنی۔ ۱۹۲۹ء میں خدائی خدمتگار اور مجلس احرار کا قیام عمل میں آیا اور اُسی سال میں نیشنلسٹ مسلمانوں نے بھی اپنی ایک کانفرنس منعقد کی۔ ۱۹۳۷ء میں جب کانگرس برسرِ اقتدار آئی اور اس نے مسلمانوں کی قومی ہستی کو ختم کرنا چاہا تو سوال پیدا ہوا کہ مسلمان اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔ اس خطرناک وقت میں مسلم لیگ کی قیادت جس زبردست شخصیت کے ہاتھ میں تھی، اس نے کانگرس کے چیلنج کو دلیری سے قبول کیا۔ یہ قائداعظم محمد علی جناحؒ تھے، جو ایک طرف سیاسی بات چیت میں انگریزی

حکومت اور کانگرسی لیڈروں کے ساتھ پورے اترے اور دوسری طرف اپنی لاجواب شخصیت کے بل پر ایک پراگندہ اقلیت کو ایک مستقل قوم بنانے میں نمایاں طور پر کامیاب ہوئے۔

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے پچیسویں سالانہ اجلاس سے اسلامی ہند کی تاریخ بیداری کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ چنانچہ ۲۳/ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ نے لاہور میں پاکستان کی قرارداد منظور کی یعنی مسلمانانِ ہند کے لیے ہندوستان کے ایک حصے میں ایک خود مختار حکومت اور ایک جداگانہ آزاد وطن کے قیام کا شاندار منصوبہ باندھا۔ اس سے مسلمان قوم میں زندگی کی ایک برقی رو دوڑ گئی۔ اب وہ محض تحفظات و مراعات کی سائل نہ رہی بلکہ ایک علیحدہ مستقل آزاد قومیت کی دعویدار بن گئی، جس کی ایک اپنی جدا حکومت ہو، ایک اپنی جدا تہذیب اور ایک اپنا جداگانہ وطن ہو۔

پاکستان کی تجویز کے بعد اس منصوبے کو تفصیل سے مکمل کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ ۱۹۴۴ء میں معاشی مسئلے پر غور کرنے کے لیے ایک تعمیری کمیٹی وضع کی گئی۔ تعلیمی مسئلے کے لیے ایک تعلیمی کمیٹی بنی اور دیگر اہم مسائل کے لیے مصنفین کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔

۱۹۴۴ء میں پنجاب میں مسلم لیگ اور یونینسٹ وزارت میں جھگڑا پیدا ہو گیا اور بمبئی[۱] میں گاندھی اور جناحؒ کی ملاقات ہوئی مگر ناکام رہی۔ ۱۹۴۵ء میں شملہ کانفرنس میں کانگرس اور لیگ کو پھر اکٹھا بلایا گیا مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ آخر حکومتِ ہند نے نئے انتخابات کا اعلان کیا اور کہا کہ برطانوی مزدور حکومت[۲] کے پیش نظر ہندوستان کو خود اختیاری حکومت دینا ہے۔

نئے انتخابات میں جو ۴۶-۱۹۴۵ء کے موسم سرما و بہار میں ہوئے، ہندوؤں میں کانگرس اور مسلمانوں میں مسلم لیگ پورے طور پر کامیاب ہو گئی۔ اتنے میں برطانوی حکومت نے ۱۹۴۶ء میں پہلے ایک وفد کو اور پھر ایک ''وزارتی مشن'' کو ہندوستان بھیجا تا کہ یہاں کی سیاسی گتھی کو سلجھائے۔ مشن نے ہندوستان کی حکومت کے لیے ایک نئی سکیم پیش کی لیکن مشن کی کانگرس نواز پالیسی سے ناراض ہو کر مسلم لیگ نے اس سکیم کو ٹھکرا دیا اور گو آخر کار وہ بھی مرکز کی عارضی حکومت میں شریک ہو گئی لیکن ادھر نہ صرف کانگرس اور لیگ میں بات بات پر اختلافات رونما ہوئے بلکہ ملک بھر میں جا بجا ہندو، مسلمانوں میں شدید فرقہ وارانہ مناقشات اور فسادات برپا ہو گئے۔ کانگرس نے مسلم لیگ سے باعزت سمجھوتا کرنے سے انکار کر دیا۔ برطانوی حکومت نے پہلے یہ اعلان کیا کہ وہ کسی ایسے دستور کو ملک میں نافذ نہیں کرے گی جس پر دونوں بڑی جماعتوں کا اتفاق رائے نہ ہو اور پھر فروری ۱۹۴۷ء میں یہ فیصلہ کیا کہ برطانیہ جون ۱۹۴۸ء تک ہندوستان کو خالی کر دے گا۔

---

[۱] نیا نام ممبئی   [۲] برطانیہ میں لیبر پارٹی کی حکومت

جنوری ۱۹۴۷ء میں پنجاب میں مسلم لیگ کی ایک زبردست تحریک اٹھی، جس میں مردوں اور عورتوں نے یکساں حصہ لیا اور جو صرف ایک ماہ جاری رہ کر بہت نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ برطانوی حکومت اس سے متاثر ہوئی اور اسے یقین ہو گیا کہ اسلامیانِ ہند کے قومی مطالبے کو اب دیر تک معرضِ التوا میں نہیں رکھا جا سکتا۔ ادھر پاکستان کے مخالفین نے ملک بھر میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع کر دیا جو آخیر سال تک جاری رہا اور جس کے ضمن میں ایک منظّم سازش کے تحت آٹھ دس لاکھ بے گناہ مسلمانوں کو بے رحمی سے تہ تیغ کر دیا گیا۔ اسی دوران میں برطانیہ نے ۳رجون کو ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے متعلق اپنا نیا منصوبہ شایع کیا جس کے مطابق ۱۵راگست ۱۹۴۷ء کو دونوں ملکوں میں دو علیحدہ علیحدہ خود مختار حکومتیں قائم ہوگئیں۔ یوں اسلامی ہند کے دس کروڑ فرزندانِ توحید کی تنظیم اور قربانیاں پھل لائیں اور مشرقی و مغربی ہند میں مشرقی و مغربی پاکستان کی بنیاد پڑی۔

پاکستان کے قیام سے نہ صرف ہندوستان کے برعظیم اور ایشیا میں بلکہ ساری اسلامی دنیا میں ایک ایسا قوت آفرین تغیّر رونما ہو گیا ہے جس کے غیر معمولی نتائج کا دنیا ابھی صحیح طور پر اندازہ نہیں کر سکتی۔ ادھر یہ امر پاکستان کی ملتِ اسلامیہ پر روز بروز واضح ہو رہا ہے کہ اگر اسے اپنی اور دنیا کی طرف اپنا اسلامی اور انسانی فرض ادا کرنا ہے تو پاکستان کی حکومت لازمی طور پر اسلامی جمہوریت کے ترقی پرور اصولوں پر قائم ہوگی، جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں سے مساوی سلوک کیا جائے گا، جس میں بڑے بڑے سرمایہ داروں کے لیے جگہ نہ ہوگی بلکہ جس میں غریبوں اور کارکنوں کا خاص طور پر خیال رکھا جائے گا، جس میں عورت کے حقوق اور اس کی شخصیت محفوظ ہوگی، جس میں دولت اِدھر تمام لوگوں میں مناسب طور پر تقسیم ہو کر اور اُدھر بیت المال میں جمع ہو کر عوام الناس کا معیارِ زندگی بڑھانے کے کام آئے گی۔

مسلمانوں کا نصب العین اسلام ہے۔ وہ اسلام نہیں جس کا ڈنکا مطلق العنان بادشاہوں اور خود غرض اُمرا نے بجایا بلکہ وہ اسلام جس کا حامل قرآن ہے، جس نے صرف اَن دیکھے خدا کے آگے سر جھکانا سکھایا۔ وہ اسلام جس کا نمونہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں مسلمانوں کی زندگیوں میں نظر آتا ہے۔ وہ سچائی، وہ دلیری، وہ خود اعتمادی، وہ انکسار و امن پسندی، وہ محنت و مساوات، وہ صبر و تقویٰ، وہ مسلم و غیر مسلم سب کی خدمت، سب کے حقوق کا تحفظ، سب سے رواداری اور محبت! یہ ہے پاکستان کے مسلمانوں کا نصب العین۔ ہمارے قومی شاعر نے اپنی قوم کے ہر فرد پر خوب روشن کر دیا ہے:

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تُو ہے

(کارنامہ اسلام)

سوالات

۱۔ مختصر جواب دیجیے:

الف۔ سید احمد بریلویؒ کے مقاصد کیا تھے؟

ب۔ سید احمد بریلویؒ نے کن حالات میں جامِ شہادت نوش کیا؟

ج۔ سرسید احمد خاں نے اپنی قوم کی کیا خدمات سرانجام دیں؟

د۔ اس سبق میں سرسید احمد خاں کے جن رفقا کا ذکر آیا ہے، ان کی کیا کیا خدمات ہیں؟

ہ۔ علامہ اقبالؒ کی تعلیمات کا نچوڑ کیا ہے؟

و۔ قائداعظمؒ نے کن حالات میں قوم کی ڈانواں ڈول کشتی کا پتوار اپنے ہاتھ میں لیا؟

ز۔ پاکستان کے قیام کے مقاصد کیا تھے؟

ح۔ پاکستان کے مسلمانوں کا نصب العین کیا ہے؟

۲۔ مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کیجیے:

الف۔ "مسلمانوں کی مساعی خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں برباد ہوگئیں۔"

ب۔ "ملک ہاتھوں سے گیا، ملّت کی آنکھیں کھل گئیں"

ج۔ "پنجاب کے مسلمان سرسید کی منادی پر اس طرح دوڑے جس طرح پیاسا پانی پر دوڑتا ہے۔"

د۔ "۱۸۹۸ء میں جب سرسیدؒ نے انتقال کیا تو ان کی قوم اپنے خوابِ گراں سے جاگ چکی تھی۔"

ہ۔ "یہ پہلا موقع تھا جب مجھے یقین ہوگیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا محال ہے اور دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔"

و۔ "امیر علی نے اپنی انگریزی تصانیف سے مغربی حلقوں میں اسلام کی وقعت پیدا کی۔"

ز۔ "جب تک قوم سیاسی حیثیت سے مضبوط و متحد نہ ہوگی، اس کی ساری روایات اکارت جائیں گی۔"

۳۔ درست بیان کے سامنے "درست" اور غلط کے سامنے "غلط" لکھیے:

الف۔ مذموم معاشرتی رسموں میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں بہت فرق تھا۔

ب۔ سیداحمد بریلویؒ ۶۔ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔

ج۔ فرائضی تحریک کا مقصد مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت کی اصلاح اور ان کی امداد تھا۔

د۔ ۱۸۳۷ء میں فارسی زبان عدالتی زبان قرار پائی۔

ہ۔ سرسیدؒ نے مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگرس میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔

و۔ حالی کی مُسدس نے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں انقلاب کی لہر دوڑادی۔

۴۔ واقعات کے سامنے درست سن لکھیے:

الف۔ سیداحمد بریلویؒ نے سکھوں کے خلاف جہاد کا آغاز کیا۔ (..........)

ب۔ جنگ بلقان وطرابلس۔ (..........)

ج۔ علی گڑھ کالج یونیورسٹی کے درجے تک پہنچا۔ (..........)

د۔ جامعہ عثمانیہ کا شاندار ادارہ قائم ہوا۔ (..........)

ہ۔ قائداعظمؒ کے چودہ نکات۔ (..........)

و۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا نفاذ۔ (..........)

ز۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی آزادی کی تحریک۔ (..........)

۵۔ اس سبق میں جن شخصیات کا ذکر آیا ہے، ان کی فہرست مرتب کیجیے اور ان کے بارے میں سبق میں دی ہوئی معلومات کے علاوہ کتب خانے سے مزید معلومات حاصل کر کے انھیں اپنے رجسٹر میں لکھیں۔

۶۔ ''پاکستان کا قیام ناگزیر تھا'' کے موضوع پر ایک مضمون لکھیں۔

۷۔ مندرجہ ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے:

عزّت خاک میں ملنا، ذلّت کے درپے ہونا، زخموں پر نمک چھڑکنا، نئی زندگی پھونکنا، خواب گراں سے جاگنا، علم کا چراغ روشن کرنا، ٹھوکریں کھانا، اظہر من الشّمس ہونا، ارادے دھرے کے دھرے رہ جانا، ہاتھ بڑھانا، سر پھر جانا، طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لینا، ڈنکا بجنا

امدادی افعال:

اردو زبان کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس میں امدادی افعال نے بڑی وسعت اور نزاکت پیدا کر دی ہے۔ تحریر و تقریر میں اکثر اوقات اصل فعل کے ساتھ کوئی دوسرا فعل یا اس کا جزو استعمال کیا جاتا ہے، جس سے اصل فعل کے معنوں میں تھوڑا بہت تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح اصل فعل کے معنوں میں زیادہ قوّت پیدا ہو جاتی ہے یا کلام میں کوئی حسن و خوبی یا فصاحت و بلاغت آ جاتی ہے۔ وہ افعال یا ان کے اجزا جو اصل فعل کی مدد یا معاونت کے لیے آتے ہیں، امدادی افعال یا فعلِ معاون کہلاتے ہیں۔

اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ تمام بنیادی افعال، امدادی افعال کے طور پر استعمال نہیں ہوتے اور تمام امدادی افعال بھی بنیادی افعال نہیں ہوتے مثلاً چکنا، سکنا، لگنا۔ اردو میں بالعموم استعمال ہونے والے امدادی افعال جن مصادر سے بنتے ہیں وہ یہ ہیں:۔

دینا، لینا، آنا، جانا، ڈالنا، پڑنا، رہنا، ہونا، بیٹھنا، اٹھنا، پانا، کرنا، نکلنا، چاہنا، رکھنا وغیرہ

عام طور پر امدادی فعل اصل فعل کے بعد آتا ہے جیسے امدادی افعال "دینا اور لینا" کی مناسبت سے یہ جملے:

میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔

یہ رقم رکھ لیجیے۔

لیکن کبھی کبھی امدادی فعل اصل فعل سے پہلے بھی آجاتا ہے۔ جیسے:

ع ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

اور تو اور وہ مجھ کو بھی لے ڈوبا۔

اب آپ اس سبق میں سے ایسے تمام امدادی افعال تلاش کر کے ایک فہرست مرتب کیجیے اور جملے بنائیے۔

☆☆☆☆☆

Freebooks.pk

ڈاکٹر مولوی عبدالحق
(۱۸۷۰ء-۱۹۶۱ء)

نواب محسن الملک[۱]

قدرت نے نواب محسن الملک مرحوم کو بہت سی خوبیاں عطا کی تھیں۔ وجاہت، ذہانت، خوش بیانی اور فیاضی ان کی ایسی عام اور ممتاز صفات تھیں کہ ایک راہ چلتا بھی چند منٹ کی بات چیت میں معلوم کر لیتا تھا۔ خطاب یا نام اٹکل سے رکھ دیے جاتے ہیں مسمّٰی کی خصوصیات کا ان میں مطلق لحاظ نہیں ہوتا۔ نام رکھتے وقت تو ممکن ہی نہیں، عطائے خطاب کے وقت بھی اس کا خیال نہیں کیا جاتا۔ لیکن محسن الملک کا خطاب ان کے لیے بہت ہی موزوں نکلا۔ ان میں پارس پتھر کی خاصیت تھی۔ کوئی ہو، کہیں کا ہو، اُن سے چھوا نہیں اور کندن کا ہوا نہیں۔ اگر کسی نے سلام بھی کر لیا تو ان پر اس کا بار رہتا تھا اور جب تک اس کا معاوضہ نہ کر لیتے، انھیں چین نہ آتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے دشمن کو بھی نہ بھولتے تھے اور یہ میں ذاتی علم سے کہتا ہوں کہ وہ بھی ان کے زیر بارِ منّت تھے۔ سیاسی مصلحتیں بعض اوقات اہلِ حکومت کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ ان افراد کو جو ان کی یا حکومت کی راہ میں حائل ہیں، دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیں۔ مرحوم کو بھی کبھی کبھی ایسا کرنا پڑتا لیکن انھوں نے اس ناگوار اور دل شکن کام کو اس خوبی اور سلیقے سے کیا کہ مخالف ہونے پر بھی محسن الملک کو دعائیں دیتے گئے اور جب تک زندہ رہے، ان کے شکر گزار رہے۔

وہ جوہر قابل تھے مگر موقعے کی تاک میں تھے۔ حیدر آباد میں ان کی سیاست دانی، تدبّر، انتظامی قابلیت کے جوہر کھلے۔ اُن کا ذہن ایسا رسا، اُن کی طبیعت ایسی حاضر، اُن کے اوسان ایسے بجا اور معاملات اور واقعات پر ایسا عبور تھا کہ بڑے بڑے پیچیدہ معاملات کو باتوں باتوں میں سلجھا دیتے تھے۔ وہ اگر ٹرکی یا کسی اور سلطنت کے فارن منسٹر ہوتے تو یقیناً دنیا میں بڑا نام پیدا کرتے، بڑے بڑے مدبّران کا لوہا مان گئے تھے۔

یوں تو انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے نواب صاحب مرحوم کے احسانات حیدر آباد اور اہلِ حیدر آباد پر بے شمار تھے لیکن ریاست کے نظم و نسق میں چند چیزیں خاص ان کی یادگار ہیں۔ مثلاً: ریاست کا بجٹ نواب صاحب نے مرتب کیا اور مصر کے بجٹ کے نمونے پر تھا جو وہاں انگریزی نگرانی کے بعد پہلی بار تیار ہوا تھا۔ بندوبست کا محکمہ بھی انھی کا قائم کیا ہوا ہے جس نے اراضی کی پیمائش کا کام کیا۔ اس کے علاوہ فنانس اور مال گزاری میں بہت سی اصلاحیں کیں جن کی تفصیل کا یہ

۱۔ محسن الملک (نواب سید مہدی علی خاں ۱۸۳۷ء-۱۹۰۷ء) سر سید احمد خاں کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ حیدر آباد دکن میں بورڈ آف ریونیو کے سربراہ رہے۔ سر سید کی وفات کے بعد علی گڑھ کالج کے سیکرٹری بنے اور اپنی ہوشمندی، تدبّر اور محنت سے کالج کو یونیورسٹی کے درجے تک پہنچایا اور اسے ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ مسلم لیگ قائم ہوئی تو وہ اس کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ مسلمانانِ ہند پر اُن کے بڑے احسانات ہیں۔

Freebooks.pk

موقع نہیں، یہ ان کے سوانح نویس کا کام ہے۔

حیدر آباد میں بڑے بڑے لوگ آئے اور گئے لیکن اب تک کسی کو وہ مقبولیت اور ہر دل عزیزی حاصل نہیں ہوئی جو نواب محسن الملک کو ہوئی۔ ہمارے ملک میں خوشامدیوں کی کوئی کمی نہیں، وہ ہر بڑے اور صاحبِ اقتدار آدمی پر اس طرح ٹوٹ کر گرتے ہیں جیسے شہد پر مکھیاں، لیکن سچ اور جھوٹ کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب وہ بڑا آدمی اپنے اقتدار یا منصب سے محروم ہو جاتا ہے۔ نواب محسن الملک کی رخصت کے وقت حیدر آباد میں کہرام مچ گیا تھا اور ہزار ہا آدمی کا ٹھٹھ سٹیشن کے باہر اور اندر لگا ہوا تھا۔ سیکڑوں آدمی جن میں امیر، غریب، بیوائیں اور یتیم سب ہی تھے، زار و قطار رو رہے تھے۔ وہ کیا چیز تھی جس نے چھوٹے بڑے سب کا دل موہ لیا تھا!

جس زمانے میں نواب صاحب پیدا ہوئے اور ہوش سنبھالا، مسلمانوں میں مذہبی جذبہ بہت بڑھا ہوا تھا۔ اس کے متعدد اسباب تھے۔ ان میں سے شاید ایک یہ بھی تھا کہ انسان جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو مذہب کی پناہ ڈھونڈتا ہے۔ مسلمان دولت و اقبال، جاہ و ثروت سب کچھ کھو چکے تھے، ایک مذہب رہ گیا تھا اس لیے یہ انھیں اور بھی عزیز ہو گیا۔ ذرا سی بدگمانی پر بھی ان کے جذبات بھڑک اُٹھتے تھے۔ اس وقت شاید ہی کوئی ایسا مصنف یا ادیب ہو جس نے مذہب پر قلم فرسائی نہ کی ہو۔ یہاں تک کہ لوگ جنھیں مسلمان نیچری کہتے تھے اور اپنے خیال میں بد مذہب و بدعقیدہ سمجھتے تھے، ان کا اوڑھنا بچھونا بھی مذہب تھا۔ سرسید تو خیر ان کے مرشد ہی تھے، ان کے حلقے کے دوسرے رکن بھی مثلاً: نواب محسن الملک، حالی، مولوی مشتاق حسین، شبلی، چراغ علی، نذیر احمد وغیرہ خواہ کچھ ہی لکھتے، تان مذہب ہی پر ٹوٹتی تھی۔ نواب صاحب مرحوم کو ابتدا ہی سے مذہبی لگاؤ تھا۔ پہلے وہ میلاد پڑھتے اور وعظ کہتے تھے۔ ان کی ایک ہی تصنیف ہے جو خالص مذہبی ہے، ورنہ اس کے سوا ان کی جتنی تحریریں ہیں وہ یا تو تعلیمی ہیں یا معاشرتی یا علمی، لیکن ان سب کا تعلق کسی نہ کسی نہج سے اسلام یا مسلمانوں سے ہے۔ گو وہ اُردو کے اعلیٰ درجے کے ادیبوں میں نہیں لیکن ان کی تحریر میں ادبیّت کی شان ضرور پائی جاتی ہے۔ روانی، فصاحت، تسلسلِ بیان ان کے کلام میں نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔ اگرچہ انگریزی نہیں جانتے تھے، لیکن انگریزی کتابیں پڑھوا کر سُنتے اور ترجمہ کرا کر مطالعہ کرتے تھے۔ ان کے مضامین میں مغربی خیالات کی ترجمانی صاف نظر آتی ہے۔

تقریر کے وقت منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ آواز میں شیرینی اور دل کشی تھی۔ اکثر لوگ جواُن سے ملنے یا کسی معاملے میں گفتگو کرنے آتے تو ان کی ذہانت اور لیاقت کے قائل ہو جاتے۔ ان کی خوش بیانی ایسی تھی کہ اکثر اوقات مخالف بھی مان جاتے تھے۔ دکن میں رہتے رہتے اور بعض امراض کی وجہ سے بھی وہ شدید موسم کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ایسے زمانے میں وہ بمبئی چلے آتے۔ بدرالدین طیب جی، سرسید احمد خاں کے مشن اور علی گڑھ کالج کے بہت مخالف تھے۔ ایک دن نواب صاحب نے بدرالدین طیب جی کے سامنے ایسی فصیح اور پُر درد تقریر کی کہ دونوں آبدیدہ ہو گئے اور تھوڑی سی دیر میں ان کی دیرینہ مخالفت کو ہمدردی سے بدل دیا اور ایک گراں قدر عطیہ کالج کے لیے ان سے وصول کر لیا۔ بمبئی میں جب آل

انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو اس کے صدر بھی بدر الدین طیب جی ہوئے۔ بڑے بڑے جلسوں میں جب معاملہ بگڑنے لگتا اور یہ اندیشہ پیدا ہو جاتا کہ کہیں جلسہ درہم برہم نہ ہو جائے، تو اس وقت نواب صاحب کی خوش بیانی، فصاحت اور ظرافت جادو کا کام کر جاتی تھی اور منغّض اور مکدّر چہرے بشاش اور شگفتہ ہو جاتے تھے۔ ان کی باتوں اور تقریروں میں ظرافت کی چاشنی بڑا مزہ دیتی تھی۔ باتوں میں ظرافت کبھی کبھی شوخی کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔

دوسروں سے کام لینے کا انھیں بڑا اچھا سلیقہ تھا۔ وہ کچھ ایسے مہر آمیز طریقے سے کہتے تھے اور اس طرح ہمت افزائی کرتے تھے کہ لوگ خوشی خوشی اُن کا کام کرتے تھے۔ اپنے ملازموں اور ماتحتوں سے بھی ان کا سلوک ایسا تھا کہ وہ ان کی فرمائش کی تعمیل ایسی تن دہی اور شوق سے کرتے تھے جیسے ان کا کوئی ذاتی کام ہو اور وقت پر جان لڑا دیتے تھے۔

آدمی کے پہچاننے میں انھیں خاص ملکہ تھا۔ تھوڑی سی ملاقات اور بات چیت میں آدمی کو پوری طرح بھانپ لیتے تھے۔ اُن کے ملنے والے بُرے اور بھلے ہر قسم کے آدمی تھے۔ دنیا نیکوں ہی کے لیے نہیں، اس میں بدوں کا بھی حصہ ہے اور شاید دنیا کی بہت کچھ رونق انھی کے دم سے ہے۔ وہ دونوں سے کام لیتے تھے۔

نواب صاحب کو مطالعے کا بہت شوق تھا۔ اخبارات اور اُردو، فارسی، عربی کتابیں برابر پڑھتے رہتے تھے۔ انگریزی کے اخبارات اور مضامین بھی پڑھوا کر سُنتے تھے۔ انگریزی کی ایسی کتابیں جو اُن کے مذاق کی ہوتی تھیں، اُن کا ترجمہ کرا کر پڑھتے اور بحث کرتے تھے۔ ان کے کتب خانے میں فارسی، عربی اور انگریزی کی اعلیٰ درجے کی کتابیں تھیں۔

سرسید کی وفات کے قریب زمانے ہی میں اُردو کی مخالفت کا آغاز ہو گیا۔ اگرچہ سرسید کی حالت اس وقت نازک تھی تو بھی اس جواں ہمت بڈھے نے اس کے متعلق لکھا پڑھی شروع کر دی تھی۔ محسن الملک کے زمانے میں مخالفت نے اور زور پکڑا۔ اُردو کی حفاظت اور حمایت کے لیے ایک انجمن قائم کی گئی جس کا ایک عظیم الشان جلسہ لکھنؤ میں ہوا اس میں نواب محسن الملک نے بڑی زبردست اور پُر جوش تقریر کی جس کا لوگوں پر بڑا اثر ہوا اور جوش کی ایک لہر پھیل گئی۔

نواب محسن الملک اسی شاہراہ پر گامزن رہے، جس کی داغ بیل سرسید ڈال گئے تھے۔ سید کے بعد محسن الملک نے اُن کے کام کو جس طرح سنبھالا، نبھایا اور بڑھایا یہ اُنھی کا کام تھا۔ ان کے بعد کوئی ان کی یادگار بنائے یا نہ بنائے محسن الملک کا کام ان کی سب سے بڑی یادگار رہے۔

(چند ہم عصر)

سوالات

۱۔ سبق کے متن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے درجِ ذیل سوالوں کے جواب دیجیے:

الف۔ نواب محسن الملک کو ریاست کے نظم و نسق اور حکومتی معاملات پر کس حد تک عبور حاصل تھا؟

ب۔ نواب محسن الملک ریاستی عوام میں کس حد تک ہر دلعزیز تھے؟

ج۔ نواب محسن الملک کی تحریر کی خصوصیات کیا ہیں؟

د۔ نواب محسن الملک کی تقریر کا انداز کس حد تک دلکش تھا؟

ہ۔ نواب محسن الملک نے بدرالدین طیب جی کو، جو سر سید اور علی گڑھ کالج کے سخت مخالف تھے، اپنا گرویدہ کیسے بنالیا؟

و۔ نواب محسن الملک کو مطالعے کا شوق کس حد تک تھا اور وہ کس قسم کی کتابیں پڑھتے تھے؟

۲۔ مندرجہ ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے:

لوہا ماننا، جوہر کھلنا، ٹوٹ کر گرنا، کہرام مچنا، دل موہ لینا، قلم فرسائی کرنا، منہ سے پھول جھڑنا، درہم برہم ہونا، جادو کا کام کرنا، جان لڑا دینا، داغ بیل ڈالنا۔

۳۔ بعض اوقات بات کی وضاحت کے لیے یا بات میں زور پیدا کرنے کے لیے مثال دی جاتی ہے۔ اسے تمثیلی انداز کہا جاتا ہے جیسے اس سبق میں آئے ہوئے یہ جملے دیکھیے:

الف۔ ان سے چُھوا نہیں اور کُندن کا ہوا نہیں۔

ب۔ وہ ہر بڑے اور صاحبِ اقتدار آدمی پر اس طرح ٹوٹ کر گرتے ہیں جیسے شہد پر مکھیاں۔

ج۔ وہ ان افراد کو جوان کی یا حکومت کی راہ میں حائل ہیں، دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیں۔

د۔ اس وقت نواب صاحب کی خوش بیانی، فصاحت اور ظرافت جادو کا کام کرتی تھی۔

اب آپ اس نوعیت کے پانچ جملے مزید لکھیے۔

۴۔ اس سبق میں سر سیّد احمد خاں کے جن جن رفقا کا ذکر آیا ہے، اُن کے ناموں کی فہرست مُرتّب کریں۔

۵۔ اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۶۔ سیاق و سباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل اقتباسات کی تشریح کیجیے:

الف۔ ان کی ایک ہی تصنیف ہے ______ ترجمانی صاف نظر آتی ہے۔

ب۔ دوسروں سے کام لینے کا ______ جان لڑا دیتے تھے۔

حرف:

قواعد میں ''حرف'' وہ غیر مستقل لفظ ہوتا ہے جو تنہا بولنے یا لکھنے میں کوئی خاص معنی پیدا نہیں کرتا جب تک کسی جملے میں یا دوسرے الفاظ کے ساتھ استعمال نہ ہو۔ مثلاً:

''نمازی مسجد میں ہے۔'' اس جملے میں لفظوں کا تعلق ''میں'' کی وجہ سے ہے۔

اردو میں ان حروف کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ ربط ۲۔ عطف ۳۔ تخصیص ۴۔ فجائیہ

۱۔ حروفِ ربط: وہ ہیں جو ایک لفظ کا تعلق کسی دوسرے لفظ سے ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً: کا، کے، کی، نے، کو، تئیں،

سے، میں، تک وغیرہ

۲۔ حروفِ عطف: وہ جو دو یا دو سے زیادہ لفظوں یا جملوں کو ملانے کا کام دیتے ہیں مثلاً: اور، مگر، تو وغیرہ۔ ان کی مزید کئی قسمیں ہیں:

۱۔ وصل ۲۔ تردید ۳۔ استدراک ۴۔ استثنا

۵۔ شرط ۶۔ علت ۷۔ بیانیہ

۳۔ حروفِ تخصیص: وہ ہیں جو کسی اسم یا فعل کے ساتھ آتے ہیں تو خصوصیت کے معنی پیدا کرتے ہیں مثلاً: ہی، تو، بھی، ہر وغیرہ

۴۔ حروفِ فجائیہ: وہ ہیں جو جوش یا جذبے میں بے ساختہ زبان سے نکل جاتے ہیں مثلاً: اے، اُف، اوہو، ہائے وغیرہ

اب آپ مندرجہ ذیل حروف کی درجہ بندی کیجیے اور انھیں اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

کہ، اور، یا، جو، ورنہ، لہٰذا، چاہے، چونکہ، تو، اگر، مگر، جبکہ، کیونکہ، صرف، بلکہ، اگرچہ، لیکن، واہ۔

☆☆☆☆☆

Freebooks.pk

مولانا محمد حسین آزاد

(۱۸۳۰ء۔۱۹۱۰ء)

محنت پسند خردمند

سیر کرنے والے گلشن حال کے اور دُور بین لگانے والے ماضی واستقبال کے، روایت کرتے ہیں کہ جب زمانہ کے پیراہن پر گناہ کا داغ نہ لگا تھا اور دنیا کا دامن بدی کے غبار سے پاک تھا تو تمام اولادِ آدم مسّرتِ عام اور بے فکری مُدام کے عالم میں بسر کرتے تھے۔ ملک، ملکِ فراغ تھا اور خسروِ آرام رحم دل، فرشتہ مقام گویا اُن کا بادشاہ تھا۔ وہ نہ رعیت سے خدمت چاہتا تھا، نہ کسی سے خراج باج مانگتا تھا۔ اس کی اطاعت وفرمانبرداری اس میں ادا ہو جاتی تھی کہ آرام کے بندے قدرتی گلزاروں میں گلگشت کرتے تھے، ہری ہری سبزے کی کیاریوں میں لوٹتے تھے، آبِ حیات کے دریاؤں میں نہاتے تھے۔ ہمیشہ وقت صُبح کا اور سدا موسم بہار کا رہتا تھا۔ نہ گرمی میں تہ خانے سجانے پڑتے، نہ سردی میں آتش خانے روشن کرتے۔ قدرتی سامان اور اپنے جسموں کی قوتیں ایسی موافق پڑی تھیں کہ جاڑے کی سختی ہو یا ہوا کی گرمی، معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔ ٹھنڈے اور میٹھے پانی نہروں میں بہتے تھے۔ چشمے پر لوگ جھکتے اور منہ لگا کر پانی پیتے تھے۔ وہ شربت سے سوا مزا اور دودھ سے زیادہ قوت دیتے تھے۔ جسمانی طاقت قوتِ ہاضمہ کے ساتھ رفیق تھی۔ بھوک نے اُن کی اپنی ہی زبان میں ذائقہ پیدا کیا تھا کہ سیدھے سادے کھانے اور جنگلوں کی پیداوار یں رنگارنگ نعمتوں کے مزے دیتے تھے۔ آب وہوا قدرتی غذائیں تیار کر کے زمین کے دسترخوان پر چُن دیتی تھیں، وہ ہزار مقوی اور مفرح کھانے کے کام دیتی تھی۔ صبا ونسیم کی شمیم میں ہوائی خوشبوؤں کے عطر مہک رہے تھے۔ بلبلوں کے چہچہے، خوش آواز جانوروں کے زمزمے سنتے تھے، خوبصورت خوبصورت چرند پرند آس پاس کلیل کرتے پھرتے تھے۔ جابجا درختوں کے جُھرمُٹ تھے۔ انھیں کے سائے میں سب چین سے زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ عیش وآرام کے قدرتی سامان اس بہتات سے تھے کہ ایک شخص کی فراوانی سے دوسرے کے لیے کمی نہ ہوتی تھی اور کسی طرح ایک دوسرے کو رنج نہ پہنچتا تھا۔ سب کی طبیعتیں خوشی سے مالا مال اور دل فارغ البال تھے۔

اتفاقاً ایک میدانِ وسیع میں تختہ پھولوں کا کھلا کہ اس سے عالم مہک گیا مگر بُو اس کی گرم اور تیز تھی۔ تاثیر یہ ہوئی کہ لوگوں کی طبیعتیں بدل گئیں اور ہر ایک کے دل میں خود بخود یہ کھٹک پیدا ہوئی کہ سامان عیش وآرام کا جو کچھ ہے میرے ہی کام آئے اور کے پاس نہ جائے۔ اس غرض سے اس گلزار میں گلگشت کے بہانے کبھی تو فریب کے جاسوس اور کبھی سینہ زوری کے شیاطین آکر چالاکیاں دکھانے لگے، پھر تو چند روز کے بعد اُن کی ذُرّیات یعنی غارت، تاراج، لوٹ مار آن پہنچے اور ڈاکے مارنے لگی۔ جب راحت وآرام کے سامان یوں پیدا ہونے لگے تو رفتہ رفتہ، غرور، خود پسندی، حسد

Freebooks.pk

نے اس باغ میں آ کر قیام کر دیا۔ اُس کے اثرِ صحبت سے لوگ بہت خراب ہوئے کیونکہ وہ اپنے ساتھ دولت کا پیمانہ لائے۔ پہلے تو خدائی کے کارخانے فارغ البالی کے آئین اور آزادی کے قانون کے بہ موجب کھلے ہوئے تھے یعنی عیش وافر اور سامانِ فراواں جو کچھ درکار ہو، موجود تھا اور اسی بے احتیاجی کو لوگ تونگری کہتے تھے، پھر یہ سمجھنے لگے کہ اگر ہمارے پاس ہر شے ضرورت سے زیادہ ہو اور ہمیں اس کی حاجت بھی ہو یا نہ ہو لیکن تونگر ہم جبھی ہوں گے جبکہ ہمسایہ ہمارا محتاج ہو۔ ہر چند اُس بیچارے ضرورت کے مارے کو خرچوں کی کثرت اور ضرورتوں کی شدّت سے زیادہ سامان لینا پڑا ہو مگر انھیں جب ہمسائے خوشحال نظر آتے تھے تو جل جاتے تھے اور اپنے تئیں محتاج خیال کرتے تھے۔

اس بدنیتی کی سزا یہ ہوئی کہ احتیاج اور اِفلاس نے بزرگانہ لباس پہنا اور ایک پیرزادے بن کر آئے۔ حضرتِ انسان، کہ طمع خام کے خمیر تھے، خسروِ آرام کی عقیدت چھوڑ کر ان کی طرف رجوع ہوئے۔ چنانچہ سب اُن کے مرید اور معتقد ہو گئے اور ہر شخص اپنے تئیں حاجت مند ظاہر کر کے فخر کرنے لگا۔ مقامِ افسوس یہ ہے کہ اس بدنیّت نحس قدم کے آنے سے ملکِ فراغ کا رنگ بالکل بدل گیا۔ یعنی انواع و اقسام کی حاجتوں نے لوگوں کو آن گھیرا۔ سال میں چار موسم ہو گئے، زمین بنجر ہو گئی، میوے کم ہونے لگے۔ ساگ پات اور موٹی قسم کے نباتات پر گزران ٹھہری۔ خزاں کے موسم میں کچھ بُرے بھلے اناج بھی پیدا ہونے لگے لیکن جاڑے نے بالکل لاچار کر دیا، کبھی کبھی قحط سالی کا ٹڈی دَل چڑھ آتا۔ اسی لشکر میں وبا اور امراض غول کے غول بیماریاں اپنے ساتھ لے کر آتے اور تمام ملک میں پھیل جاتے۔ غرض عالم میں ایسا تہلکہ پڑا کہ اگر ملکِ فراغ کے انتظام میں نئی اصلاح نہ کی جاتی تو یک قلم برباد ہو جاتا۔ سب دُکھ تو سہ سکتے تھے مگر قحط کی مصیبت غضب تھی۔ چونکہ یہ ساری نحوستیں احتیاج اور افلاس کی نحوست سے نصیب ہوئی تھیں، اس لیے سب اپنے کیے پر پچھتائے۔

عالم کا رنگ بے رنگ دیکھ کر تدبیر اور مشورہ دو تجربہ کار دنیا سے کنارہ کش ہو گئے تھے اور ایک سیب کے درخت میں جُھولا ڈالے الگ باغ میں جُھولا کرتے تھے، البتہ جو صاحبِ ضرورت اُن کے پاس جاتا، اسے صلاحِ مناسب بتا دیا کرتے تھے۔ یہ سب مل کر اُن کے پاس گئے کہ برائے خدا کوئی ایسی راہ نکالیے جس سے احتیاج و افلاس کی بلا سے بندگانِ خدا کو نجات ہو۔ وہ بہت خفا ہوئے اور کہا کہ اپنے کیے کا علاج نہیں۔ خسروِ آرام ایک فرشتہ سیرت بادشاہ تھا۔ تم نے اُس کا حق شکر نہ ادا کیا اور اس آفت کو اپنے ہاتھوں سر لیا۔ یہ افلاس ایسی بُری بلا ہے کہ انسان کو بے کس اور بے بس کر دیتی ہے۔ مانگے تانگے کے سوا خود اس کا کچھ پیشہ نہیں۔ دیکھو! اسی نے ملکِ فراغ کو کیسا تباہ کر دیا ہے کہ دلوں کے باغ ہرے بھرے ویران ہوتے جاتے ہیں۔ اب اس کے نکلنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر یہ کہ ہم نے سنا ہے، احتیاج و افلاس کا ایک بیٹا بھی ہے۔ جس کا نام محنت پسند خردمند ہے۔ اس کا رنگ ڈھنگ کچھ اور ہے، کیونکہ اس نے امید کا دودھ پیا ہے، ہنرمندی نے اسے پالا ہے، کمال کا شاگرد ہے۔ ہو سکے تو جا کر اس کی خدمت کرو۔ اگرچہ اسی کا فرزند ہے، لیکن اوّل تو سلطنت کا مقدمہ درمیان ہے، دوسرے ماں کے دودھ کا زور اس کے بازوؤں میں ہے۔ استاد کی پھرتی اور چالاکی

طبیعت میں ہے۔شاید کچھ کر گزرے۔ تدبیر اور مشورے کا سب نے شکریہ ادا کیا اور سیدھے محنت پسند خردمند کے سراغ پر آئے۔ دامنِ کوہ میں دیکھا کہ ایک جوان قوی ہیکل کھڑا ہے۔ چہرہ اس کا ہوا سے جھریایا ہوا، دھوپ سے تمتمایا ہوا، مشقت کی ریاضت سے بدن اینٹھا ہوا، پسلیاں ابھری ہوئیں، ایک ہاتھ میں کچھ کھیتی کا سامان، ایک ہاتھ میں معماری کے اوزار لیے ہانپ رہا ہے اور ایسا معلوم ہوا کہ ابھی ایک بُرج کی عمارت کی بنیاد ڈالی ہے [1]۔ سب نے جھک کر سلام کیا اور ساری داستان اپنی مصیبت کی سنائی۔

وہ انھیں دیکھتے ہی ہنسا اور ایک قہقہہ مار کر پکارا کہ آؤ انسانو! نادانو! آرام کے بندو! عیش کے پابندو! آؤ آؤ آج سے تم ہمارے سپرد ہوئے۔ اب تمھاری خوشی کی امید اور بچاؤ کی راہ اگر ہے تو ہمارے ہاتھ ہے۔ خسروِ آرام ایک کمزور، کام چور، بے ہمت، کم حوصلہ، بھولا بھالا، سب کے منہ کا نوالہ تھا، نہ تمھیں سنبھال سکا، نہ مصیبت سے نکال سکا۔ بیماری اور قحط سالی کا ایک ریلا بھی نہ ٹال سکا۔ پہلے ہی حملے میں تمھیں چھوڑ دیا اور ایسا بھاگا کہ پھر مُڑ کر نہ دیکھا۔ سلطنت کو ہاتھ سے کھویا اور تم کو منجدھار میں ڈبویا۔ آج سے تم ہماری خدمت میں حاضر رہو۔ ہماری آواز پر آیا کرو۔ ہم تمھیں ایسی ایسی تدبیریں سکھائیں گے کہ جس سے یہ شوریت زمین کی دور ہو جائے گی۔ ہوا کی شدّت اعتدال پائے گی۔ گرمی سے سردی کی خوراک نکل آئے گی۔ ہم تمھارے لیے پانی سے مچھلیاں، ہوا سے پرندے، جنگل سے چرندے نکالیں گے۔ زمین کا پیٹ چاک کر ڈالیں گے اور پہاڑوں کی انتڑیاں تک نکالیں گے۔ ایسے ایسے دھات اور جواہرات دیں گے کہ تمھارے خزانوں کے لیے دولت ہو، ہاتھوں میں طاقت ہو اور بدن کی حفاظت ہو۔ زبردست حیوانوں کے شکار کرو گے اور اُن کے آزاروں سے محفوظ رہو گے۔ جنگل کے جنگل کاٹ ڈالو گے۔ پہاڑ کے پہاڑ اکھاڑو گے۔ تم دیکھنا، میں زمانے کو وابستۂ تدبیر اور تمام عالم کو اپنے ڈھب پر تسخیر کرلوں گا۔

غرض ان باتوں سے سب کے دلوں کو لبھالیا۔ وہ بھی سمجھے کہ محنت پسند خردمند بنی آدم کا خیرخواہ ہمارا دلی دوست ہے۔ ہاتھ جوڑ جوڑ اس کے پاؤں پر گرے۔ ہمت اور تحمل اُس کے پہلو میں کھڑے تھے۔ اسی وقت انھیں جماعتِ مذکور پر افسر کر دیا۔

الغرض ہمت اور تحمل ان سب کو جنگلوں اور پہاڑوں میں لے گئے۔ کانوں کا کھودنا، اتار چڑھاؤ ہموار کرنا، تالابوں سے پانی سینچنا، دریاؤں کی دھاروں کا رخ پھیرنا، سب سکھایا۔ لوگوں کے دلوں پر اس کی بات کا ایسا اثر ہوا تھا کہ سب دفعتہً کمریں باندھ، آنکھیں بند کر، دیمک کی طرح رُوئے زمین کو لپٹ گئے۔

عالمِ صورت چند روز میں رنگ نکال لایا مگر نئے ڈھنگ سے یعنی ساری زمین شہر قصبوں اور گاؤں سے بھر گئی۔ کھیت اناج سے اور باغ میووں سے مالا مال ہو گئے۔ شہروں میں بازار لگ گئے۔ عمارتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ گھر آباد

---

[1] اس عمارت سے گویا وہ کاروبار مراد ہیں جن میں آئندہ یہ لوگ گزران کر کے اپنی قسمت سنواریں گے۔

ہو گئے۔ جدھر دیکھو، ڈالیوں اور گلزاریوں میں میوے دھرے، دستر خوان گھروں میں سجے، ذخیرے غلّوں سے بھرے، کیا گھر، کیا باہر، اس کے سوا کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ غرض محنت پسند خرد مند نے اس فرمانبردار رعیت کی بدولت یہ کامیابیاں اور فتوحاتِ نمایاں حاصل کر کے سلطانِ محنت پسند کا لقب حاصل کیا اور جا بجا ملک اور شہر قائم کر کے اپنی سلطنت جمائی۔

(نیرنگِ خیال)

سوالات

۱۔ مختصر جواب دیجیے:

الف۔ زمانے کے پیراہن پر گناہ کا داغ لگنے سے پہلے لوگ کس طرح کی زندگی بسر کرتے تھے؟

ب۔ جب غرور، خود پسندی اور حسد نے دنیا میں ڈیرے ڈالے تو لوگوں کی طبائع پر کیا اثرات ہوئے؟

ج۔ احتیاج اور افلاس نے حضرتِ انسان پر کیا کیا اثرات ڈالے؟

د۔ محنت پسند خرد مند سے رجوع کرنے کے کیا اسباب ہوئے؟

ہ۔ محنت پسند خرد مند کی شکل و شباہت کیسی ہے؟

و۔ زمانے میں ہمت اور تحمل کا عمل دخل ہوا تو اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟

ز۔ انسان کو دنیا میں کون سے رویے زیب دیتے ہیں؟

۲۔ سبق کے متن کے پیشِ نظر محنت کی برکات پر ایک مضمون لکھیں۔

۳۔ سبق کے حوالے سے درست لفظ کی مدد سے خالی جگہ پُر کیجیے:

الف۔ ہمیشہ وقت صُبح کا اور سدا موسم ____ کا رہتا تھا۔ (گرمی، خزاں، بہار)

ب۔ یہ ____ ایسی بُری بلا ہے کہ انسان کو بے کس اور بے بس کر دیتی ہے۔ (دولت، مشقت، افلاس)

ج۔ اپنے کیے کا ____ نہیں۔ (علاج، فائدہ، نقصان)

د۔ جاڑے نے بالکل ____ کر دیا۔ (بے حال، افسردہ، لاچار)

ہ۔ عمارتیں ____ سے باتیں کرنے لگیں۔ (زمین، آسمان، درختوں)

۴۔ درست بیان کے سامنے "درست" اور غلط کے سامنے "غلط" لکھیے:

الف۔ خسروِ آرام رعیت سے خدمت چاہتا تھا۔

ب۔ جب راحت و آرام کے سامان پیدا ہونے لگے تو رفتہ رفتہ غرور، خود پسندی اور حسد نے باغ سے کُوچ کیا۔

ج۔ پہلے اسی بے احتیاجی کو لوگ تونگری کہتے تھے۔

د۔ چونکہ یہ ساری نحوستیں احتیاج اور افلاس کی نحوست سے نصیب ہوئی تھیں، اس لیے سب اپنے کیے پر پچھتائے۔

ہ۔ خسرو آرام ایک ظالم و جابر بادشاہ تھا۔

و۔ محنت پسند خردمند احتیاج و افلاس کا بیٹا ہے۔

ز۔ محنت پسند خردمند نے امید کا دودھ پیا ہے، ہنرمندی نے اسے پالا ہے اور وہ کمال کا شاگرد ہے۔

رموزِ اوقاف:

رموزِ اوقاف کی علامتوں کے بغیر تحریر میں نکھار نہیں آتا۔ یہ دراصل وہ علامتیں ہیں جو ایک جملے کو دوسرے جملے سے یا کسی جملے کے ایک حصے کو دوسرے حصوں سے علیحدہ کریں۔ رموزِ اوقاف کی مدد سے پڑھنے والے کو معلوم ہو جاتا ہے کہ جملوں کو کس طرح پڑھنا ہے یا جملے کے کس حصے کو کس طرح ادا کرنا ہے اور کہاں کہاں اور کس قدر توقف کرنا ہے۔ اگر یہ علامتیں نہ ہوں تو عبارت الفاظ و حروف کا ملغوبہ بن کر رہ جائے اور اس کا مفہوم سمجھنے میں دشواری پیش آئے۔ ان کے نہ ہونے سے عبارت کے خلط ملط ہونے کا اندیشہ بھی رہتا ہے۔ رموزِ اوقاف کا فائدہ یہ ہے کہ ان کی وجہ سے پڑھنا آسان ہو جاتا ہے، نظر کو سکون ملتا ہے اور پڑھنے والا ہر جملے کے ہر جُز کی اہمیت جان لیتا ہے۔

رموزِ اوقاف کا آغاز بغداد، دمشق اور اندلس کے عرب علما نے کیا۔ اہلِ یورپ نے علمائے اندلس کی تقلید کی اور تھوڑے سے تغیر سے ان ہی اوقاف کو اپنے یہاں رائج کر لیا۔ آج دنیا کی کم و بیش ہر علمی و ادبی زبان میں رموزِ اوقاف کے طور پر کچھ نہ کچھ علامتیں مقرر اور مستعمل ہیں۔ اُردو میں اس مقصد کے لیے جو علامتیں استعمال کی جاتی ہیں، ان کے نام اور شکلیں حسبِ ذیل ہیں:

نام علامت	شکل	نام علامت	شکل
سکتہ یا وقفِ خفیف	،	استفہامیہ یا سوالیہ	؟
وقفہ یا نصف وقف	؛	ندائیہ یا فجائیہ	!
رابطہ یا وقف لازم	:	واوین	" "
تفصیلیہ	:۔	قوسین	( )
ختمہ یا وقف مطلق	۔	خط یا لکیر	ــــــ

سبق میں رموزِ اوقاف کے طور پر جو علامتیں استعمال ہوئی ہیں، آپ ان علامتوں کو تلاش کیجیے اور استاد کی مدد سے ان کا استعمال ذہن نشین کیجیے۔

☆☆☆☆☆

مولوی نذیر احمد

(۱۸۳۶ء ۔ ۱۹۱۲ء)

ebooks.pk Freebooks.pk

اکبری کی حماقتیں

{ اکبری (مزاج دار بہو) ایک خاصی بے وقوف اور پھوہڑ لڑکی ہے جس کی شادی محمد عاقل سے ہوئی۔ اس نے ساس سسر سے لڑنے جھگڑنے کے بعد روٹھ کر اپنے خاوند کے ساتھ الگ گھر میں رہنا شروع کیا لیکن اس کی بدانتظامی اور ناسمجھی نے گھر کو برباد کر کے رکھ دیا۔ اسی دوران میں وہ کٹنی کے ہتھے چڑھ گئی۔ }

اتفاق سے ان دنوں ایک کٹنی شہر میں وارد تھی اور ہر جگہ اس کا غُل تھا۔ محمد عاقل نے بھی بی بی سے کہ دیا تھا کہ کسی اجنبی عورت کو گھر میں مت آنے دینا، اِن دنوں ایک کٹنی آئی ہوئی ہے، کئی گھروں کو لوٹ چکی ہے لیکن مزاج دار شدت سے بے وقوف تھی۔ اس کی عادت تھی کہ ہر ایک سے جلد گھل مل جانا۔ ایک دن وہی کٹنی حجّن کا بھیس بنا، اس گلی میں آئی۔ یہ مکار حجّن بے وقوف عورتوں کو پھسلانے کے لیے طرح طرح کے تبرّکات اور صدہا قسم کی چیزیں اپنے پاس رکھا کرتی تھی: تسبیح، خاکِ شفا، زمزمیاں، مدینہ منورہ کی کھجوریں، کوہِ طور کا سرمہ، خانہ کعبہ کے غلاف کا ٹکڑا، عقیق البحر اور مونگے کے دانے اور نادِ علی، پنج سورہ اور بہت سی دعائیں۔ گلی میں آ کر جو اس نے اپنی دکان کھولی تو بہت سی لڑکیاں جمع ہو گئیں۔ مزاج دار نے بھی سنا۔ زلفن سے کہا ”گلی سے اٹھنے لگے تو حجّن کو یہاں بلا لانا۔ ہم بھی تبرکات کی زیارت کریں گے۔“ زلفن جا کھڑی ہوئی اور حجّن کو بلا لائی۔ مزاج دار نے بہت خاطر داری سے حجّن کو پاس بٹھایا اور سب چیزیں دیکھیں۔ سرمہ اور نادِ علی دو چیزیں پسند کیں۔ حجّن نے مزاج دار کو باتوں ہی باتوں میں تاڑ لیا کہ یہ عورت جلد ڈھب پر چڑھ جائے گی۔ ایک پیسے کا بہت سا سرمہ تول دیا اور دو آنے کو نادِ علی حوالے کی اور فیروزے کی ایک انگوٹھی تبرّک کے طور پر اپنے پاس سے مفت دی۔ مزاج دار ریجھ گئی۔ اس کے بعد حجّن نے سمندر کا حال، عرب کی کیفیت اور دل سے جوڑ کر دو چار باتیں ایسی کیں کہ مزاج دار نے کمال شوق سے سنا اور اس کی طرف ایک خاص التفات کیا۔ حجّن نے پوچھا ”کیوں بی تمھارے کوئی بال بچہ نہیں؟“

مزاج دار نے آہ کھینچ کر کہا: ”ہماری تقدیر ایسی کہاں تھی؟“

حجّن نے پوچھا: ”بیاہ کو کتنے دن ہوئے؟“

مزاج دار نے کہا: ”ابھی برس روز نہیں ہوا۔“

مزاج دار کی بے عقلی کا اب تو حجّن کو یقین ہوا اور دل میں کہنے لگی کہ اس نے تو اولاد کا نام سن کر ایسی آہ کھینچی جیسے

برسوں کا امیدوار۔ جُگن نے کہا: ''ناامیدی کی بات نہیں۔ تمھارے تو اتنے بچے ہوں گے کہ تم سنبھال بھی نہ سکو گی۔ البتہ بالفعل اکیلے گھر میں جی گھبراتا ہوگا۔ میاں کا کیا حال ہے؟''

مزاج دار نے کہا: ''ہمیشہ مجھ سے ناخوش رہا کرتے ہیں۔''

غرض پہلی ہی ملاقات میں مزاج دار نے جُگن کے ساتھ ایسی بے تکلفی کی کہ اپنا حال جزو وکل اس سے کہہ دیا اور جُگن نے باتوں ہی باتوں میں تمام بھید معلوم کرلیا۔ ایک پہر کامل جُگن بیٹھی رہی۔ رخصت ہونے لگی تو مزاج دار نے بہت منت کی کہ اچھی بی جُگن، اب کب آؤ گی؟ جُگن نے کہا: ''میری بھانجی موم گروں کے چھتے میں رہتی ہے اور بہت بیمار ہے۔ اسی کے علاج کے واسطے میں آگرے سے آئی ہوں۔ اس کے دوا معالجے سے فرصت کم ہوتی ہے، مگر ان شاء اللہ دوسرے تیسرے دن تم کو دیکھ جایا کروں گی۔''

اگلے دن جُگن پھر آموجود ہوئی اور ایک ریشمی ازار بند لیتی آئی۔ مزاج دار دور سے جُگن کو آتے دیکھ کر خوش ہو گئی اور پوچھا: ''یہ ازار بند کیسا ہے؟''

جُگن نے کہا: ''بِکاؤ ہے۔''

مزاج دار نے پوچھا: ''کتنے کا ہے؟''

جگن نے کہا: ''چار آنے کا۔ محلے میں ایک بیگم رہتی ہیں، اب غریب ہوگئی ہیں۔ اسباب بیچ بیچ کر گزر کرتی ہیں۔ میں اکثر ان کی چیزیں بیچ دیا کرتی ہوں۔''

مزاج دار اتنا سستا ازار بند دیکھ کر لوٹ ہوگئی۔ فوراً پیسے نکال، جُگن کے ہاتھ پر رکھ دیے اور بہت گڑگڑا کر کہا: ''اچھی بی! جو چیز بکاؤ ہوا کرے، پہلے مجھ کو دکھا دیا کرو۔''

جُگن نے کہا: ''بہت اچھا، پہلے تم، پیچھے اور۔''

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں۔ چلتے ہوئے جُگن نے ایک بٹوا نکالا، اس میں کپڑے اور کاغذ کی کئی تہوں میں تھوڑی لونگیں تھیں، ان میں سے دو لونگیں جُگن نے مزاج دار کو دیں اور کہا کہ دنیا میں ملاقات اور محبت اس واسطے ہوا کرتی ہے کہ ایک دوسرے کو فائدہ ہو، یہ دو لونگیں میں تم کو دیتی ہوں، ایک تو تم اپنی چوٹی میں باندھ لو، دوسری بہتر تھا کہ تمھارے میاں کی پگڑی میں رہتی، پر تمھارے میاں شاید شبہ کریں، خیر تکیے میں سی دو اور ان کا اثر آج ہی دیکھ لینا لیکن اتنی احتیاط کرنا کہ پاک صاف جگہ میں رہیں اور اپنے قد کے برابر ایک کلاوہ مجھ کو ناپ دو۔ میں تم کو ایک گنڈا بنوا لا دوں گی۔ میں جب حج کو گئی تھی تو اسی جہاز میں ایک بھوپال کی بیگم بھی سوار تھیں۔ شاید تم نے ان کا نام بھی سنا ہو، بلقیس جہانی بیگم، سب کچھ خدا نے ان کو دے رکھا تھا، دولت کی کچھ انتہا نہ تھی، نوکر چاکر، لونڈی، غلام پالکی نالکی سبھی کچھ تھا، ایک تو اولاد کی

طرف سے رنجیدہ رہا کرتی تھیں، کوئی بچہ نہ تھا، دوسرے نواب صاحب کو ان کی طرف مطلق التفات نہ تھا، شاید اولاد نہ ہونے کے سبب محبت نہ کرتے ہوں، ورنہ بیگم صورت میں چندے آفتاب، چندے ماہتاب اور حسن و دولت پر مزاج ایسا سادہ کہ ہم جیسے ناچیزوں کو برابر بٹھانا اور پوچھنا۔ بیگم کو فقیروں پر پرلے درجے کا اعتقاد تھا۔ ایک دفعہ سنا کہ تین کوس پر کوئی کامل وارد ہے۔ اندھیری رات میں گھر سے پیادہ پا ان کے پاس گئیں اور پہر تک ہاتھ باندھے کھڑی رہیں۔ فقیروں کے نام کے قربان جایئے۔ ایک مرتبہ جو شاہ صاحب نے آنکھ اٹھا کر دیکھا، فرمایا کہ جا مائی رات کو حکم ملے گا۔ بیگم کو خواب میں بشارت ہوئی کہ حج کو جا اور مراد کا موتی سمندر سے نکال لا، صبح کو اُٹھ کر حج کی تیاریاں ہونے لگیں، پانسو مسکین بیگم نے آپ کرایہ دے جہاز پر سوار کرائے۔ ان میں سے ایک میں بھی تھی، ہر وقت کا پاس رہنا، بیگم صاحبہ (الٰہی دونوں جہان میں سرخ رو) مجھ پر بہت مہربانی کرنے لگیں اور سہیلی کہا کرتی تھیں، دس دن تک برابر جہاز پانی میں چلا، گیارھویں دن بیچ سمندر کے ایک پہاڑ دکھائی دیا۔ ناخدا نے کہا: ”کوہِ حبشہ یہی ہے۔“ ایک بڑا کامل فقیر اس پر رہتا تھا، جو گیا بامراد آیا، بیگم صاحب نے ناخدا سے کہا کہ کسی طرح مجھ کو اس پہاڑ پر پہنچاؤ، ناخدا نے کہا، حضور! جہاز تو پہاڑ تک نہیں پہنچ سکتا، البتہ اگر آپ ارشاد کریں تو جہاز کو لنگر کریں اور آپ کو ایک کشتی میں بٹھا کر لے چلیں۔ بیگم نے کہا، خیر یہ سہی۔ پانچ عورتیں بیگم کے ساتھ کوہِ حبشہ پر گئی تھیں، ایک میں اور چار اور۔ پہاڑ پر پہنچے تو عجیب طرح کی خوشبو مہک رہی تھی۔ چلتے چلتے شاہ صاحب تک پہنچے۔ ہُو کا مقام تھا۔ نہ آدمی نہ آدم زاد۔ تن تنہا شاہ صاحب ایک غار میں رہتے تھے۔ کیسی نورانی شکل تھی، جیسے فرشتہ۔ ہم کو دعا دی، بیگم کو بارہ لونگیں دیں اور کچھ پڑھ کر دم کر دیا۔ مجھ سے کہا، چلی جا۔ آگرے اور دلی میں لوگوں کے کام بنا۔ بیٹی، ان بارہ لونگوں میں سے دو لونگیں یہ ہیں۔ ہم سب حج کر کے لوٹے تو نواب صاحب یا تو بیگم کی بات نہ پوچھتے تھے، یا یہ نوبت ہوئی کہ ایک مہینے آگے سے بمبئی میں آ کر بیگم کو لینے کو پڑے تھے، جوں ہی بیگم نے جہاز پر سے پاؤں اتارا، نواب صاحب نے اپنا سر بیگم کے قدموں میں رکھ دیا اور رو رو کر خطا معاف کرائی۔ چھے برس میں بھوپال میں حج سے واپس آ کر ٹھہری۔ فقیر کی دعا کی برکت سے لگا تار اوپر تلے اللہ رکھے چار بیٹے بیگم کے میرے رہتے ہو چکے تھے۔ پھر مجھ کو اپنا دیس یاد آیا۔ بیگم سے اجازت مانگی۔ بہت روکا، میں نے کہا کہ شاہ صاحب نے مجھ کو دلی، آگرے کی خدمت سپرد کی ہے۔ مجھ کو وہاں جانا ضرور ہے۔ یہ سن کر بیگم نے چار و ناچار مجھ کو رخصت کیا۔

دو لونگیں، اس کے ساتھ دو ورق کی حکایتِ دلچسپ۔ مزاج دار دل و جان سے معتقد ہو گئیں۔ کٹنی تو لونگیں دے کر رخصت ہوئی، مزاج دار بہو نے غسل کر، کپڑے بدل، خوشبو لگا، ایک لونگ بسم اللہ کر کے اپنی چوٹی میں باندھی اور میاں کے پلنگ کی چادر اور تکیوں کے غلاف بدل ایک لونگ کسی تکیے میں رکھ دی۔ محمد عاقل جو گھر آیا، بی بی کو دیکھا صاف ستھری، پلنگ کی چادر بے کہے بدلی ہوئی۔ خوش ہوا اور التفات کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔

مزاج دار نے کہا: ''دیکھو ہم نے آج ایک چیز مول لی ہے۔'' یہ کہہ کر ازار بند دکھایا۔

محمد عاقل نے کہا: ''کتنے کو لیا ہے؟''

مزاج دار نے کہا: ''تم آنکو، کتنے کا ہے؟''

وہ ازار بند خاص لاہور کا بنا ہوا نہایت عمدہ تھا۔ چوڑا چکلا، کلابتو کی لچھے دار ہڑیں۔ محمد عاقل نے کہا ''دو روپے سے کسی طرح کم نہیں۔''

مزاج دار: چار آنے کو لیا ہے۔

محمد عاقل: سچ کہو۔

مزاج دار: تمھارے سر کی قسم، چار ہی آنے کو لیا ہے۔

محمد عاقل: بہت سستا ہے۔ کہاں سے مل گیا؟

مزاج دار: ایک جُجن بڑی نیک بخت ہے۔ بہت دنوں سے گلی میں آیا کرتی ہے۔ کسی بیگم کا ہے۔ بیچنے کو لائی تھی۔

یہ کہہ کر سرمہ، نادِ علی، فیروزے کی انگوٹھی بھی مزاج دار نے دکھائی۔ طمع ایسی چیز ہے کہ بڑا سیانا آدمی بھی دھوکا کھا جاتا ہے۔ جنگلی جانور، مینا، طوطا، لال، بلبل آدمی کی شکل سے بھاگتے ہیں، لیکن دانے کی طمع سے جال میں پھنس جاتے ہیں اور زندگی بھر قفس میں قید رہتے ہیں۔ اسی طرح محمد عاقل اپنا فائدہ دیکھ کر خوش ہوا اور جب مزاج دار نے کہا کہ وہ جُجن بیگم کا تمام اسباب جو بکنے کو نکلے گا، میرے پاس لانے کا وعدہ کر گئی ہے تو محمد عاقل نے کہا: ''ضرور دیکھنا چاہیے، لیکن ایسا نہ ہو چوری کا مال ہو، پیچھے خرابی پڑے اور ہاں جُجن کوئی ٹھگنی نہ ہو۔''

مزاج دار نے کہا: ''خدا خدا کرو! وہ جُجن ایسی نہیں ہے۔''

غرض بات گئی گزری ہوئی۔ محمد عاقل سے جو آج ایسی باتیں ہوئیں، لوگوں پر مزاج دار کا اعتقاد جم گیا۔ اگلے دن زلفن کو بھیج جُجن کو بلوایا اور آج مزاج دار بیٹی بنیں اور جُجن کو ماں بنایا۔ رات کے وقت محمد عاقل سے پھر جُجن کا ذکر آیا۔ محمد عاقل نے کہا: ''دیکھو، ہوشیار رہنا۔ اس بھیس میں کٹنیاں اور ٹھگنیاں بہت ہوا کرتی ہیں۔'' لیکن طمع نے خود محمد عاقل کی عقل پر ایسا پردہ ڈال دیا کہ اتنی موٹی بات وہ نہ سمجھا کہ دو روپے کا مال چار آنے میں کوئی بے وجہ بھی دیتا ہے۔ محمد عاقل کو مناسب تھا کہ قطعاً جُجن کے آنے کی ممانعت کرتا اور سب چیزیں اس کی پھروا دیتا۔ مزاج دار کو اتنی عقل کہاں تھی کہ اس تہ کو سمجھتی۔ کئی دن کے بعد مزاج دار نے جُجن سے پوچھا: ''کیوں بی، آج کل بیگم کا کوئی سامان نہیں لاتیں؟''

جّن نے جان لیا کہ اس کو اچھی چاٹ لگ گئی ہے۔ کہا: ''تمھارے ڈھب کی کوئی چیز نکلے تو لاؤں۔'' دو چار دن کے بعد جھوٹے موتیوں کی ایک جوڑی لائی اور کہا: ''لو بی، خود بیگم کی نتھ کے موتی ہیں۔ نہیں معلوم ہزار کی جوڑی ہے یا پانسو کی۔ پنّا مل جوہری کی دکان پر میں نے دکھائی تھی' لٹو ہو گیا۔ دو سو روپے زبردستی میرے پلّے باندھ دیتا تھا۔ میں بیگم سے پچاس روپے میں لائی ہوں۔ تم لے لو۔ پھر ایسا مال نہ ملے گا۔''

مزاج دار نے کہ ''پچاس روپے نقد تو میرے پاس نہیں ہیں۔''

جّن نے کہا: ''کیا ہوا بیٹی۔ پہنچیاں بیچ کر لے لو۔ نہیں تو آج یہ موتی بک جائیں گے۔'' جّن نے ایسے ڈھب سے کہا کہ مزاج دار فوراً زیور کا صندوقچہ اٹھا لائی اور جّن کو پہنچیاں نکال حوالے کر دیں۔ جمن نے مزاج دار کا زیور دیکھ کر کہا ''اے ہے! کیسی بے احتیاطی سے زیور مولی گاجر کی طرح ڈال رکھا ہے۔ بیٹی، دھگدگی میں ڈورا ڈلواؤ۔ بالی پتے، گلوبند، بازوبند میلے چیکٹ ہو گئے ہیں۔ میل سونے کو کھائے جاتا ہے۔ ان کو اُجلواؤ۔''

مزاج دار نے کہا: ''کون ڈورا ڈلوائے اور کون اُجلوا کر لائے۔ ان سے کہتی ہوں تو وہ کہتے ہیں مجھے فرصت نہیں۔''

جمن نے کہا: ''اوئی بیٹی! یہ کون سا بڑا کام ہے۔ لو، موتی رہنے دو۔ میں ابھی ڈورا ڈلوا دوں اور جو زیور میلا ہے، نکال دو۔ میں ابھی اُجلوا دوں۔''

مزاج دار نے سب زیور حوالے کیا۔ جّن نے کہا: ''زلفن کو بھی ساتھ کر دو۔ سنار کے پاس بیٹھی رہے گی۔ میں پٹوے سے ڈورے ڈلواؤں گی۔''

مزاج دار نے کہا: ''اچھا۔'' یہ کہ کر زلفن کو آواز دی، آئی تو جّن نے کہا: ''لڑکی، ذرا میرے ساتھ چل۔ سنار کی دکان پر بیٹھی رہیو۔''

جّن نے زیور لیا۔ زلفن ساتھ ہوئی۔ گلی سے باہر نکلی جمن نے رومال کھولا اور زلفن سے کہا، لاؤ اجلوانے کے الگ کر لیں اور ڈورا ڈلوانے کے الگ۔ زیور کو الگ کرتے کرتے جمن بولی: ''ایں! ناک کی کیل کیا ہوئی؟''

زلفن نے کہا: ''اسی میں ہو گی۔ ذرہ بھر کی تو چیز ہے۔ اسی پوٹلی میں دیکھو۔''

پھر جّن آپ ہی آپ بولی: ''اے ہے! پان دان کے ڈھکنے پر رکھی رہ گئی۔ اری زلفن دوڑ کر جا۔ جلدی سے لے آ۔''

زلفن بھاگی بھاگی آئی اور دروازے سے چلّائی: ''بی بی، ناک کی کیل پان دان کے ڈھکنے پر رہ گئی ہے۔ جّن نے مانگی ہے۔ جلدی دو۔ جّن گلی کے نکڑ پر دِینا بنیے کی دکان کے آگے بیٹھی ہے۔''

یہ کہنا تھا کہ مزاج دار بہو کا ماتھا ٹھنکا۔ زلفن سے کہا: ''باولی ہوئی ہے؟ کیسی کیل؟ میرے پاس کہیں تھی؟ تو نے دیکھی ہے؟ اری کم بخت! دوڑ۔ دیکھ تو جُجن کہیں چلی نہ جائے۔''

زلفن الٹے پاؤں دوڑی گئی۔ جُجن کو ادھر ادھر دیکھا، کہیں پتا نہ تھا۔ مزاج دار سے آ کر کہا: ''بی جُجن کا تو کہیں پتا نہیں۔ میں بازار تک دیکھ آئی۔ اتنی دیر میں نہیں معلوم کہاں غائب ہوگئی۔'' یہ سن کر مزاج دار سر پیٹنے لگی: ''ہائے! میں لٹ گئی! ہائے! میں لٹ گئی! ارے لوگو! خدا کے لیے دوڑیو۔''

موم گروں کے چھتے تک لوگ دوڑے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ کہیں کی بہتی بہاتی مہینے بھر سے کرائے پر آ کر رہی تھی۔ چار دن سے مکان چھوڑ چلی گئی۔ اب کیا ہوسکتا تھا۔ محمد عاقل نے آ کر سنا تو سر پیٹ لیا اور بیوی سے کہا: ''اری! تو گھر کو خاک سیاہ کر کے چھوڑے گی۔ میں تو تجھ کو پہلے سے جانتا ہوں۔''

مزاج دار نے کہا: ''چل دور ہو۔ اب باتیں بنانے کھڑا ہوا ہے۔ ازار بند دیکھ کر تو نے مجھ سے کہا تھا کہ بیگم کا اسباب ضرور دیکھنا۔''

غرض خوب مزے کی لڑائی دونوں میاں بی بی میں ہوئی۔ تمام محلّہ جمع ہوگیا۔ بات پر بات چلی تو معلوم ہوا کہ اسی جُجن نے کنجنی کی گلی میں احمد بخش خان کی بی بی کا تمام زیور اس حیلے سے ٹھگ لیا کہ ایک فقیر سے دُونا کرا دوں گی۔ روئی کے کٹڑے میں میاں مسیتا کی بیٹی سے ایسی محبت بڑھائی کہ اس کا زیور بہانے سے اڑا لے گئی۔ غرض زیور تو گیا گزرا ہوا، باتیں بہت سی رہ گئیں۔ برتن چوری جا چکے تھے۔ زیور یوں غارت ہوا۔ ہزار روپے کے موتیوں کی جوڑی جو لوگوں نے دیکھی تو تین پیسے کی تھی۔ تھانے میں اطلاع ہوئی۔ لوگوں نے بطورِ خود بہت ڈھونڈا، جُجن کا سراغ نہ ملا پر نہ ملا۔

اکبری کو جہیز میں جو کپڑے ملے تھے، ان کا حال سنیے۔ جب تک ساس کے ساتھ رہیں، ساس دسویں دن نکال کر دھوپ دے دیا کرتی تھیں۔ شروع برسات میں الگ ہو کر رہیں۔ کپڑوں کا صندوق جس کوٹھڑی میں جس طرح رکھا گیا تھا، تمام برسات گزر گئی، اس کو دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ وہیں اسی طرح رکھا رہا۔ جاڑے کی آمد میں دولائی کی ضرورت ہوئی تو صندوق کھولا گیا۔ بہت کپڑوں کو دیمک چاٹ گئی تھی۔ چوہوں نے کاٹ کاٹ کر بغارے ڈال دیے تھے۔ کوئی کپڑا اسلامت نہیں بچنے پایا۔

اکبری کا جتنا حال تم نے پڑھا، اس سے تم کو معلوم ہوا ہوگا کہ اکبری کو نانی کے لاڈ پیار نے زندگی بھر کیسی مصیبت میں رکھا۔ لڑکپن میں اکبری نے نہ کوئی ہنر سیکھا نہ کچھ اس کے مزاج کی اصلاح ہوئی۔ جب اکبری نے ساس سے جدا ہو کر الگ گھر کیا، برتن بھانڈا، کپڑا زیور سب کچھ اس کے پاس موجود تھا، چونکہ خانہ داری کا سلیقہ نہیں رکھتی تھی چند روز میں تمام مال و اسباب خاک میں مِلا دیا اور ایک ہی برس میں ہاتھ کان سے ننگی رہ گئی۔ اگر محمد عاقل بھی اس کی طرح احمق اور

بدمزاج ہوتا تو شاید ایک دوسرے سے قطع تعلق ہو جاتا، لیکن محمد عاقل نے ہمیشہ عقل و شرافت کو برتا۔ ہم کو اکبری کے اتنے حالات معلوم ہیں کہ اگر ہم سب کو لکھنا چاہیں تو ایسی تین چار کتابیں بنیں مگر اکبری کے حالات پڑھنے سے کبھی تو غصہ آتا ہے اور کبھی طبیعت کُڑھتی ہے۔ اس سے اس کے زیادہ حالات لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔

(مرأۃ العروس)

سوالات

۱۔ مختصر جواب دیجیے:

الف۔ کٹنی نے اکبری کو پھانسنے کے لیے اسے کن کن تبرّکات کی زیارت کرائی اور اکبری نے کن دو چیزوں کو پسند کیا؟

ب۔ اکبری نے دو روپے والا ازار بند چار آنے میں خریدا تو محمد عاقل نے اس کی حوصلہ افزائی کیوں کی؟

ج۔ کٹنی نے اکبری سے اس کا سارا زیور کس بہانے سے ہتھیا لیا؟

د۔ کٹنی نے زلفن کو کیا کہہ کر واپس گھر بھیج دیا؟

ہ۔ کٹنی نے اکبری کے علاوہ اور کس کس کو اپنے جال میں پھنسایا؟

و۔ اکبری نے اپنے جہیز کے کپڑوں کا ستیاناس کیسے کیا؟

۲۔ کٹنی نے اکبری کو بھوپال کی بیگم کا جو خود ساختہ واقعہ سنایا، اسے اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۳۔ آپ کے خیال میں اکبری سے کون کون سی حماقتیں سرزد ہوئیں؟

۴۔ بعض لوگوں کو اعتراض ہے کہ مولوی نذیر احمد اپنے ناپسندیدہ کرداروں کے عیب بیان کرتے ہوئے مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ آپ کے خیال میں اکبری کی حماقتیں معاشرتی نوعیت کی ہیں یا انھیں بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے؟

۵۔ اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۶۔ جاہل اور کمزور ایمان کے لوگ عموماً توہم پرست ہوتے ہیں۔ سبق میں توہم پرستی کی چند مثالیں موجود ہیں۔ ان میں سے دو کی نشاندہی کیجیے اور انھیں اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۷۔ درج ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے:

ڈھب پر چڑھنا، ریجھ جانا، آہ کھینچنا، لوٹ ہو جانا، چاٹ لگنا، لٹو ہو جانا، ماتھا ٹھنکنا،

سر پیٹ لینا، گھر کو خاک سیاہ کر کے چھوڑنا، اڑا لینا۔

۸۔ درج ذیل جملوں کی وضاحت کیجیے:۔

الف۔ محجن نے مزاج دار کو باتوں ہی باتوں میں تاڑ لیا کہ یہ عورت جلد ڈھب پر چڑھ جائے گی۔

ب۔ اپنے قد کے برابر ایک کلاوہ مجھ کو ناپ دو، میں تم کو ایک گنڈا بنوا لا دوں گی۔

ج۔ مزاج دار بیٹی بنیں اور محجن کو ماں بنایا۔

د۔ کہیں کی بہتی بہاتی مہینے بھر سے کرائے پر آ کر رہی تھی۔

ہ۔ محجن کا سراغ نہ ملا پر نہ ملا۔

و۔ ایک ہی برس میں ہاتھ کان سے ننگی رہ گئی۔

۹۔ درج ذیل اقتباسات کی سیاق و سباق کے حوالے سے تشریح کیجیے:

الف۔ طمع ایسی چیز ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محجن کوئی ٹھگنی نہ ہو۔

ب۔ اکبری کو نانی کے لاڈ پیار نے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہاتھ کان سے ننگی رہ گئی۔

مطابقت:

مطابقت کے معنی ہیں مطابق ہونا، موافق ہونا یا برابر ہونا لیکن قواعد کی رُو سے فعل کی اپنے فاعل اور مفعول کے ساتھ، صفت کی اپنے موصوف کے ساتھ اور علامتِ اضافت (کا، کے، کی) کی اپنے مضاف کے ساتھ نسبت کے بدلنے کو مطابقت کہتے ہیں۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ فعل اپنے فاعل اور مفعول کے ساتھ، صفت اپنے موصوف کے ساتھ اور علامتِ اضافت اپنے مضاف کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔ مثلاً ان جملوں پر غور کیجیے:

ماں چلی گئی' بیٹا چلا گیا۔ ماں اور بیٹا دونوں چلے گئے۔

علم انسان کا درجہ بڑھا دیتا ہے۔ علم اور نیک چلن، انسان کا درجہ بڑھا دیتے ہیں۔

لڑکی نے پانی پیا۔ لڑکے نے کہانی پڑھی۔

☆☆☆☆☆

نسیم حجازی

(۱۹۱۴ء--۱۹۹۶ء)

پہلی فتح

صبح کی نماز کے بعد دمشق کے لوگ بازاروں اور مکانوں کی چھتوں پر کھڑے محمد بن قاسم کی فوج کا جلوس دیکھ رہے تھے۔ دنیا کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ فوج کی قیادت ایک سترہ سالہ نوجوان کے سپرد تھی۔ دمشق سے لے کر بصرہ تک راستے کے ہر شہر اور بستی سے کئی کم سن لڑکے، نوجوان اور بوڑھے اس فوج میں شامل ہوئے۔ کوفہ اور بصرہ میں محمد بن قاسم کی روانگی کی اطلاع مل چکی تھی اور نوجوان عورتیں اپنے شوہروں، مائیں اپنے بیٹوں اور لڑکیاں اپنے بھائیوں کو نوجوان سالار کا ساتھ دینے کے لیے تیار رہنے پر آمادہ کر رہی تھیں۔ غیور قوم کی ایک بے کس بیٹی کی فریاد بصرہ اور کوفہ کے ہر گھر میں پہنچ چکی تھی۔ بصرے کی عورتوں میں زبیدہ کی تبلیغ کے باعث یہ جذبہ پیدا ہو چکا تھا کہ ناہید[1] کا مسئلہ قوم کی ہر بہو بیٹی کا مسئلہ ہے۔ نوجوان لڑکیاں مختلف محلوں اور کوچوں سے زبیدہ کے گھر آتیں اور اس کی تقاریر سے ایک نیا جذبہ لے کر واپس جاتیں۔ خرابی صحت کے باوجود محمد بن قاسم کی والدہ بصرہ کی معمر عورتوں کی ایک ٹولی کے ساتھ جہاد کی تبلیغ کے لیے ہر محلے کی عورتوں کے پاس پہنچتی۔ زبیدہ نے چند نئے سپاہیوں کو گھوڑے اور اسلحہ جات بہم پہنچانے کے لیے اپنے تمام زیورات بیچ ڈالے۔ بصرہ کے تمام امیر و غریب گھرانوں کی لڑکیوں نے اس کی تقلید کی اور مجاہدین کی اعانت کے لیے بصرہ کے بیت المال کو چند دنوں میں سونے اور چاندی سے بھر دیا۔ عراق کے دوسرے شہروں کی خواتین نے اس کارِ خیر میں بصرہ کی عورتوں سے پیچھے رہنا گوارا نہ کیا اور وہاں بھی لاکھوں روپے جمع ہو گئے۔

محمد بن قاسم نے بصرہ میں تین دن قیام کیا۔ اس کی آمد سے پہلے بصرہ میں حجاج بن یوسف کے پاس مکران کے گورنر محمد بن ہارون کا یہ پیغام پہنچ چکا تھا کہ عبید اللہ کی قیادت میں بیس آدمیوں کا جو وفد دیبل بھیجا گیا تھا، اس میں سے صرف دو نوجوان جان بچا کر مکران پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ باقی تمام دیبل کے گورنر نے قتل کر دیے ہیں۔ اس خبر نے بصرہ کے عوام میں انتقام کی سلگتی ہوئی آگ پر تیل کا کام دیا۔

دمشق سے روانگی کے وقت محمد بن قاسم کی فوج کی تعداد کل پانچ ہزار تھی لیکن جب وہ بصرے سے روانہ ہوا تو اس کے لشکر کی مجموعی تعداد بارہ ہزار تھی جن میں سے چھے ہزار سپاہی گھڑ سوار تھے، تین ہزار پیدل اور تین ہزار سامانِ رسد کے اونٹوں کے ساتھ تھے۔

---

[1] وہ خاتون جس نے حجاج بن یوسف کو خط لکھا تھا۔

محمد بن قاسم شیراز سے ہوتا ہوا مکران پہنچا۔ مکران کی سرحد عبور کرنے کے بعد لسبیلہ کے پہاڑی علاقے میں اُسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بھیم سنگھ بیس ہزار فوج کے ساتھ لسبیلہ کے سندھی گورنر کی اعانت کے لیے پہنچ چکا تھا۔ اُس نے ایک مضبوط پہاڑی قلعے کو اپنا مرکز بنا کر تمام راستوں پر اپنے تیر انداز بٹھا دیے۔ اپنے باپ کی مخالفت کے باوجود وہ راجا کو اس بات کا یقین دلا چکا تھا کہ اُس کے بیس ہزار سپاہی بارہ ہزار مسلمانوں کو لسبیلہ سے آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔

مسلمانوں کے پہاڑی علاقے میں داخل ہوتے ہی بھیم سنگھ کے سپاہیوں نے اِکا دُکا حملے شروع کر دیے۔ تیس چالیس سپاہیوں کا گروہ اچانک کسی ٹیلے یا پہاڑی کی چوٹی پر نمودار ہوتا اور آن کی آن میں محمد بن قاسم کی فوج کے کسی حصے پر تیر اور پتھر برسا کر غائب ہو جاتا۔ گھوڑوں کے سوار اِدھر اُدھر ہٹ کر اپنا بچاؤ کر لیتے لیکن شتر سوار دستوں کے لیے یہ حملے بڑی حد تک پریشان کُن ثابت ہوئے۔ بعض اوقات بدک کر اِدھر اُدھر بھاگنے والے اونٹوں کو منظم کرنا حملہ کرنے والوں کے تعاقب سے زیادہ مشکل ہو جاتا۔

محمد بن قاسم نے یہ دیکھ کر ہراول کے پیادہ دستوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا لیکن حملہ آوروں کی ایک جماعت آگے سے کترا کر بھاگتی اور دوسری جماعت پیچھے سے حملہ کر دیتی۔ ایک گروہ کسی ٹیلے پر چڑھ کر لشکر کے دائیں بازو کو اپنی طرف متوجہ کرتا اور دوسرا بائیں بازو پر حملہ کر دیتا۔ جوں جوں محمد بن قاسم کی فوج آگے بڑھتی گئی، ان حملوں کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ رات کے وقت پڑاؤ ڈالنے کے بعد شب خون کے ڈر سے کم از کم ایک چوتھائی فوج کو آس پاس کے ٹیلوں پر قابض ہو کر پہرہ دینا پڑتا۔

ایک شام محمد بن قاسم کو ایک جاسوس نے اطلاع دی کہ شمال کی طرف بیس کوس کے فاصلے پر ایک مضبوط قلعہ اس لشکر کا مستقر ہے۔ محمد بن قاسم نے اپنے تجربہ کار سالاروں کی ایک مجلسِ شوریٰ بلائی۔ بعض سالاروں کی یہ صلاح تھی کہ اس راستے کو چھوڑ کر سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ نسبتاً ہموار راستہ اختیار کیا جائے۔ ہم اس قلعے سے جس قدر دور ہوں گے اسی قدر ان حملوں سے محفوظ رہیں گے لیکن محمد بن قاسم ان سے متفق نہ ہوا۔ اس نے کہا: ”جب تک یہ علاقہ دشمن سے پاک نہیں ہوتا۔ ہمارا آگے بڑھنا خطرے سے خالی نہیں۔ یہ قلعہ ان کے دفاع کی اہم چوکی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس قلعے کے فتح ہو جانے کے بعد دشمن یہ تمام علاقہ خالی کرنے پر مجبور ہو جائے گا اور دشمن کے جو سپاہی یہاں سے فرار ہوں گے، وہ دیبل پہنچ کر ایک شکست خوردہ ذہنیت کا مظاہرہ کریں گے لیکن اگر ہم یہاں سے کترا کر نکل گئے تو ان کے حوصلے بڑھ جائیں گے اور ہمارا عقب ہمیشہ غیر محفوظ رہے گا۔ ہمارا پہلا مقصد اس قلعے کو فتح کرنا ہے۔ اس قلعے کی فتح کے بعد اگر پہاڑیوں میں چھپے ہوئے لشکر کی تعداد کافی ہوئی تو وہ اس علاقے میں ہمارے ساتھ فیصلہ کن جنگ لڑنے کی کوشش کرے گا اور اس میں بھی ہماری بہتری ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری پیش قدمی روکنے کے لیے اس قلعے کے محافظوں کی زیادہ تعداد آس پاس کی پہاڑیوں پر منقسم ہے۔ میں آج سورج نکلنے سے پہلے اس قلعے پر حملہ کرنا چاہتا ہوں اور اس مقصد کے لیے میں اپنے ساتھ فقط پانچ سو

پیادہ سپاہی لے جانا چاہتا ہوں۔ آپ باقی فوج کے ساتھ رات بھر پیش قدمی جاری رکھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ چاروں اطراف کا خیال چھوڑ کر آپ کا راستہ روکنے کی فکر کریں گے۔ چاندنی رات میں آپ کے لیے آگے بڑھنے کا راستہ زیادہ خطرناک ثابت ہوگا۔ اگر صبح تک آپ کو قلعہ فتح ہو جانے کی خبر پہنچ جائے تو آپ پیش قدمی روک کر میرے احکام کا انتظار کریں۔ اگر قلعہ فتح ہو جانے کے بعد دشمن نے کسی جگہ منظم ہو کر مقابلے کی ہمت کی تو میں قلعے کی حفاظت کے لیے چند آدمی چھوڑ کر آپ کے ساتھ آملوں گا اور اگر انھوں نے قلعے کو دوبارہ فتح کرنا چاہا تو آپ وہاں پہنچ جائیں۔''

ایک بوڑھے سالار نے کہا: ''مجھے یقین ہے کہ ان شاء اللہ آپ کی کوئی تدبیر غلط نہ ہوگی لیکن سپہ سالار کا فوج کے ساتھ رہنا ہی مناسب ہے۔ سپہ سالار کی جان بہت قیمتی ہوتی ہے۔ وہ فوج کا آخری سہارا ہوتا ہے۔ اگر اس خطرناک مہم میں آپ کو کوئی حادثہ پیش آ گیا تو......''

محمد بن قاسم نے جواب دیا: ''قادسیہ کی جنگ میں ایرانیوں کو اپنے زبردست لشکر کے باوجود اس لیے شکست ہوئی کہ انھوں نے اپنی طاقت سے زیادہ رستم کی شخصیت سے امیدیں وابستہ کیں۔ رستم مارا گیا تو وہ مسلمانوں کی مٹھی بھر جماعت کے مقابلے سے بھاگ نکلے لیکن اس کے برعکس مسلمانوں کے سپہ سالار سعدؓ بن وقاص گھوڑے پر چڑھنے کے قابل نہ تھے اور انھیں میدان سے الگ ایک طرف بیٹھنا پڑا لیکن مسلمانوں کی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ انھیں اپنے سپہ سالار کی عدم موجودگی کا احساس تک بھی نہ تھا۔ ہماری تاریخ میں آپ کو کوئی ایسا واقعہ نہیں ملے گا، جب سالار کی شہادت سے بد دل ہو کر مجاہدوں نے ہتھیار ڈال دیے ہوں۔ ہم بادشاہوں اور سالاروں کے لیے نہیں لڑتے۔ ہم خدا کے لیے لڑتے ہیں۔ بادشاہوں اور سالاروں پر بھروسہ کرنے والے ان کی موت کے بعد مایوس ہو سکتے ہیں لیکن ہمارا خدا ہر وقت موجود ہے۔ قرآن میں ہمارے لیے اس کے احکام موجود ہیں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خدا مجھے قوم کے لیے رستم نہ بنائے بلکہ مجھے مثنیٰؓ بننے کی توفیق دے جن کی شہادت نے ہر مسلمان کو جذبۂ شہادت سے سرشار کر دیا تھا۔ میرے لیے اس سپہ سالار کی جان کی کوئی قیمت نہیں جو اُسے اپنے سپاہیوں کی تلواروں کے پہرے میں چھپا کر رکھتا ہے اور اپنے بہادروں کو جان کی بازی لگانے کے بجائے جان بچانے کی ترغیب دیتا ہے۔ اگر اس قلعے کو فتح کرنا اس قدر اہم نہ ہوتا تو میں یہ مہم شاید کسی اور کے سپرد کر دیتا لیکن اس مہم کا خطرہ اور اس کی اہمیت دونوں اس بات کے متقاضی ہیں کہ میں خود اس کی رہنمائی کروں۔''

زبیر نے کہا: ''میں آپ کے ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔''

محمد بن قاسم نے جواب دیا: ''نہیں میں ایک قلعہ فتح کرنے کے لیے دو دماغوں کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میری غیر حاضری میں تمھارا فوج کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ میں اپنی جگہ محمد بن ہارون کو مقرر کرتا ہوں اور تم اس کے نائب ہو۔''

(محمد بن قاسم)

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل کے مختصر جواب لکھیے:

الف۔ کس خبر نے بصرہ کے لوگوں کو زیادہ مشتعل کیا؟

ب۔ راستے کا قلعہ پہلے فتح کرنے میں محمد بن قاسم نے کیا مصلحت محسوس کی؟

ج۔ قادسیہ کی جنگ میں زبردست فوج کے باوجود ایرانیوں کو کیوں شکست ہوئی؟

د۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی جنگ کا کیا فرق ہے؟

۲۔ اپنے اُستاد کی رہنمائی سے مندرجہ ذیل فقروں کی وضاحت کیجیے:

الف۔ ''غیور قوم کی ایک بے کس بیٹی کی فریاد بصرے اور کوفے کے ہر گھر میں پہنچ چکی تھی۔''

ب۔ ''خدا مجھے قوم کے لیے رستم نہ بنائے بلکہ مجھے مثنیٰؓ بننے کی توفیق دے۔''

۳۔ اب آپ ناول ''محمد بن قاسم'' کا مطالعہ کیجیے اور ناول کے ہیرو محمد بن قاسم کے کردار کی خوبیاں بیان کیجیے۔

۴۔ درج ذیل مصادر کو امدادی افعال کے طور پر اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

دینا، لینا، آنا، جانا، پڑنا، چکنا، رکھنا، اٹھنا

۵۔ درج ذیل حروف کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

نہ صرف.........بلکہ، جوں جوں.........توں توں،

جیسے جیسے.........ویسے ویسے، چونکہ.........اس لیے

مضمون:

مضمون ایک ایسی نثری تحریر ہے جس میں زندگی کے کسی بھی شعبے سے متعلق کسی بھی موضوع پر اپنے خیالات وجذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مضمون کی بالعموم ایک خاص ترتیب ہوتی ہے۔ سب سے پہلے زیرِ بحث موضوع کا تعارف کرایا جاتا ہے اور پھر اس کے بارے میں معلومات پیش کرنے کے بعد نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔

مضمون قدرے مختصر مگر جامع ہونا چاہیے۔ چونکہ روزمرّہ بول چال کی زبان سب سے عمدہ تحریر ہوتی ہے اس لیے مضمون نگار کو چاہیے کہ وہ روزمرہ سے قریب رہ کر حتی الامکان شگفتہ اور رواں زبان استعمال کرے۔ مضمون نگار کے لیے موضوع کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کیونکہ اگر مضمون نگار موضوع سے منسلک نہ رہے گا یا خیالات کی ترتیب کو گڈمڈ کر دے گا تو اس کا مضمون اچھا تاثر پیش نہیں کرے گا۔

☆☆☆☆☆

Freebooks.pk

میرزا ادیب

(۱۹۱۴ء-۱۹۹۹ء)

دستک

(ایک سٹیج ڈراما)

کردار: ڈاکٹر زیدی

بیگم زیدی

ڈاکٹر برہان

منظر:

ڈاکٹر زیدی کا کمرہ

(ڈاکٹر صاحب پلنگ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ عمر پچپن کے لگ بھگ، فرنچ کٹ ڈاڑھی، چہرے پر نقاہت نمایاں، اس وقت انھوں نے کمبل لپیٹ رکھا ہے۔ پلنگ کے پاس چھوٹی میز پر مختلف شیشیاں پڑی ہیں۔

رات طوفانی، تیز و تند ہوا کا مستقل شور ہو رہا ہے۔ بیگم زیدی آرام کرسی پر بیٹھی کسی رسالے کا مطالعہ کر رہی ہیں۔ عمر پچاس کے قریب۔ سردی کی وجہ سے شال اوڑھ رکھی ہے۔

ڈاکٹر کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یکا یک ان کی نظر سامنے دروازے پر جا پڑتی ہے۔ جس پر نیلے رنگ کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ بیگم انھیں دیکھتی ہیں اور پھر رسالے کی ورق گردانی کرنے لگتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کچھ کہتے ہیں مگر بہت آہستہ۔ صرف ان کے ہونٹ حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر کمبل اپنے جسم سے ہٹانے لگتے ہیں۔ بیگم کی نظر پڑتی ہے۔)

بیگم: کیا ہے زیدی؟

زیدی: دستک سنی؟

بیگم: دستک!

زیدی: سنی نہیں تم نے؟

(ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ رک جاتے ہیں)

بیگم: ہو تو سنوں بھی! کہاں ہے دستک؟

زیدی: کہاں ہے دستک! یہ کیا کہ رہی ہو تم؟

دیکھو تو جا کر۔ کوئی آیا ہے دروازے پر۔ کوئی کھٹکھٹا رہا ہے دروازہ!

بیگم: کوئی نہیں ہے۔

زیدی: صاف آواز آ رہی ہے۔ نہیں جانا چاہتیں تو میں خود............

(ڈاکٹر صاحب کمبل ہٹانے لگتے ہیں)

(بیگم رسالہ کرسی پر رکھ کر اٹھتی ہیں اور ان کی طرف آتی ہیں)

بیگم: کیا کر رہے ہیں آپ؟

زیدی: دیکھتا ہوں دروازے پر کون ہے۔ تم تو جاتی ہی نہیں!

بیگم: مہربانی کر کے بیٹھے رہیے! دروازے پر کوئی بھی نہیں ہے۔

زیدی: تو یہ دستک!

(بیگم ان کے گرد کمبل لپیٹنے لگتی ہے)

بیگم: تیز ہوا کا شور ہے۔

زیدی: تیز ہوا دروازے پر دستک دیا کرتی ہے! تم جا کے دیکھو تو ذرا۔

بیگم: میں کہتی ہوں کوئی نہیں ہے۔ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں!

زیدی: ذرا سنو تو۔ صاف بالکل صاف۔ دستک نہیں تو اور کیا ہے؟

بیگم: آپ کا وہم ہے!

زیدی: دیکھو! اب زیادہ زور سے ہونے لگی ہے۔ یہ وہم ہے کیا؟

(پھر اٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بیگم ان کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے)

بیگم: خدا کے لیے لیٹے رہیے! آپ تو خود ڈاکٹر ہیں، ڈاکٹر ہو کر ایسی حرکتیں کر رہے ہیں! اپنی حالت کا کچھ تو خیال کریں۔

زیدی: تم ایک مرتبہ جا کر دیکھ نہیں آتیں!

بیگم: میں جانتی ہوں دروازے پر کوئی نہیں، خیر دیکھ آتی ہوں۔

(یوں سر کو جنبش دیتی ہیں جیسے اس کام کو بیگار سمجھ رہی ہیں، دروازے کی طرف جاتی ہیں۔ زیدی انھیں ٹکٹکی

باندھے دیکھتے رہتے ہیں، بیگم پردے کے پیچھے چلی جاتی ہیں، دو تین لمحوں کے بعد پردے سے باہر آتی ہیں۔)

زیدی: کون ہے؟

بیگم: کون ہوگا!

(بیگم واپس آتی ہیں)

زیدی: تم نے دروازہ کھولا تھا؟

بیگم: (ذرا غصے سے) تو کیا دروازہ کھولے بغیر ہی کہہ رہی ہوں۔ نہ جانے بیٹھے بیٹھے کیا ہو جاتا ہے آپ کو۔ کوئی آئے گا تو کال بیل نہیں دیکھے گا۔ دروازے پر ہی دستک دے گا۔

(ڈاکٹر اور بیگم ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر کی نظروں میں بے اعتباری سی ہے اور بیگم کی نظروں میں شکایت)

زیدی: مگر یہ دستک!

بیگم: (الفاظ کاٹتے ہوئے) آپ آرام نہیں کریں گے، ڈاکٹر ہو کر۔

زیدی: (بیوی کے الفاظ کاٹ کر) بار بار مجھے کیوں بتا رہی ہو کہ میں ڈاکٹر ہوں۔

بیگم: وہ اس لیے کہ آپ کو عام لوگوں سے بالکل مختلف ہونا چاہیے، اگر ڈاکٹر بھی کسی واہمے کا شکار ہو جائے تو پھر اس کے علم سے کیا فائدہ۔

زیدی: شاید تم سچ ہی کہتی ہو۔

بیگم: (آواز میں نرمی) آپ خود ہی بتائیے ایک ڈاکٹر حقیقت پسند نہیں ہوگا تو اور کون ہوگا؟

زیدی: دروازے پر دستک کی آواز سننا حقیقت کے خلاف ہے؟

بیگم: جب دستک ہی نہ ہو اور اصرار کیا جائے کہ آواز سنی ہے، اس وقت آواز سننا کس طرح حقیقت ہوئی؟

(ڈاکٹر سر جھکا کر اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ بیگم انھیں دیکھتی رہتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی نظریں بے اختیار سامنے پردے پر پڑتی ہیں۔ تیز و تند ہوا کا شور بڑھ گیا ہے۔ شاید بارش شروع ہو گئی ہے۔)

لیٹ جائیں نا! (ڈاکٹر صاحب اپنے خیال میں غرق ہیں)

زیدی: کیا کہا؟

بیگم: لیٹ جائیے!

زیدی: تم نے دروازہ کھول کر دیکھا تھا نا؟

بیگم: حد ہوگئی ہے۔ آپ لیٹ کیوں نہیں جاتے، آدھی رات ہو چکی ہے ابھی تک جاگ رہے ہیں۔ ڈاکٹر برہان نے کہا تھا آپ کو مکمل آرام کی ضرورت ہے!

زیدی: یہ بات میں خود نہیں جانتا؟

بیگم: کیوں نہیں جانتے۔ جانتے ہیں اور خوب جانتے ہیں۔ ڈاکٹر برہان نے کہا تھا میں خود آکر دوا پلاؤں گا۔ یاد نہیں رہا اسے۔ صبح آئے گا۔

زیدی: اچھا لڑکا ہے۔

بیگم: میں نے اتنا ذمے دار اور فرض شناس نوجوان آج تک نہیں دیکھا۔ سوائے کام کے اور کچھ سوجھتا ہی نہیں اسے۔ ہر وقت کام۔ دن ہو یا رات۔ کام کے علاوہ اور کوئی غرض نہیں! یہ ہے فرض شناسی!

زیدی: ڈاکٹر کو فرض شناس ہی ہونا چاہیے!

(یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر صاحب پھر سامنے پردے کو دیکھنے لگتے ہیں)

بیگم: آپ پھر۔ توبہ ہے۔۔ ڈاکٹر برہان آئیں گے تو کہوں گی!

زیدی: کیا کہوگی؟

بیگم: یہ بھی تو ایک بیماری ہے۔ دروازے پر کوئی ہے نہیں اور آپ ہیں کہ دستک کی آواز سن رہے ہیں۔ ایک بار نہیں کئی بار ایسا ہوا ہے۔

(دروازے کی گھنٹی بجتی ہے)

زیدی: اب تو آیا ہے کوئی!

بیگم: شاید ڈاکٹر برہان ہیں!

(بیگم دروازے کی طرف جاتی ہیں اور پردے کے پیچھے غائب ہو جاتی ہیں۔ چند لمحوں کے بعد جب باہر نکلتی ہیں تو ان کے ساتھ ڈاکٹر برہان بھی آتے ہیں۔

ڈاکٹر برہان عمر کے لحاظ سے بالکل نوجوان ہیں، ہاتھ میں ڈاکٹروں والا بیگ، برساتی پہن رکھی ہے)

برہان: (دور ہی سے) السلام علیکم ڈاکٹر صاحب!

زیدی: وعلیکم السلام! بڑی تکلیف کی بیٹا! اس وقت آنے کی کیا ضرورت تھی۔ صبح دیکھا جاتا۔

برہان: کوئی بات نہیں۔

بیگم: ہاں بیٹا! اس وقت بھلا کیا ضرورت تھی آنے کی۔

برہان: آج شام سے پہلے دو کیس ایسے آ گئے کہ فرصت ہی نہ ملی، بڑا مصروف رہا۔

(برہان آگے بڑھتے ہیں۔ بیگ چھوٹی میز پر رکھ دیتے ہیں)

کہیے ٹمپریچر لیا؟

بیگم: تھوڑی دیر پہلے لیا تھا۔ سو (۱۰۰) ہے۔

برہان: سینے میں تو درد نہیں؟

زیدی: نہیں۔

برہان: شکر ہے اور کوئی بات؟

بیگم: گھبراہٹ سی ہے۔

برہان: کوئی بات نہیں۔ میرا خیال ہے انجکشن میں ناغہ کر دیا جائے۔

زیدی: یہ ٹھیک ہے۔

(بیگم جلدی سے بائیں دروازے میں سے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ برہان ایک بوتل اٹھاتے ہیں۔)

برہان: سیرپ ختم ہو گیا ہے۔ کل آؤں گا تو لے آؤں گا۔

زیدی: تو آپ چلے؟

برہان: جی ہاں!

بیگم: (دوسرے کمرے سے) ڈاکٹر صاحب!

برہان: جی!

بیگم: ذرا ٹھہریے۔

برہان: مجھے جلدی ہے ذرا۔

بیگم: بس ایک دو منٹ، چائے لا رہی ہوں۔

برہان: اوہو آپ نے کیوں تکلیف کی؟

(بیگم آتی ہیں)

بیگم: آپ بھی تو سردی میں آئے ہیں۔ برساتی اتار دیجیے۔

(برہان برساتی اتار کر کرسی کے بازو پر پھیلا دیتے ہیں۔ بیگم چلی جاتی ہیں)

زیدی: بیٹھ جائیے۔

(برہان کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں)

برہان: اور تو کوئی تکلیف نہیں؟

(بیگم ٹرے میں چائے کی تین پیالیاں لے کر آتی ہیں)

بیگم: میں بتاتی ہوں ڈاکٹر صاحب!

(ٹرے برہان کی طرف بڑھاتی ہیں۔ وہ ایک پیالی اُٹھا لیتے ہیں، بیگم دوسری پیالی شوہر کو، اور تیسری پیالی اپنے دائیں ہاتھ میں لے کر خالی ٹرے جھک کر میز کے ساتھ لگا دیتی ہیں)

برہان: (گھونٹ لے کر) آپ کیا بتا رہی تھیں؟

بیگم: ڈاکٹر صاحب! یہ بات بتاتے ہوئے مجھے کچھ عجیب سا احساس ہوتا ہے، شاید آپ اس پر یقین نہ کریں گے مگر۔

(شوہر کی طرف دیکھتی ہیں جو نگاہیں جھکائے چائے پینے میں مصروف ہیں)

برہان: فرمائیے تو۔

بیگم: انھیں ایک وہم ہو گیا ہے۔

برہان: وہم!

بیگم: (مسکرا کر) آپ کہیں گے ڈاکٹر اور وہم۔۔ یہ کیا بات ہوئی!

برہان: جی میں نہیں کہوں گا۔ میں جانتا ہوں انسانی فطرت بڑی پراسرار ہوتی ہے اور ڈاکٹر بھی تو ایک انسان ہی ہوتا ہے۔

(بیگم ایک بار پھر شوہر کو دیکھتی ہیں۔ وہ بدستور چائے پینے میں مصروف ہیں)

بیگم: چائے پیجیے نا۔

برہان: بہتر۔

(برہان پیالی ہونٹوں سے لگا لیتے ہیں۔ بیگم بھی چائے پیتی ہیں)

بیگم: پتا نہیں کیا بات ہے۔ بیٹھے بیٹھے خیال کرنے لگتے ہیں کہ دروازے پر دستک ہو رہی ہے۔ حالانکہ دروازے پر کوئی بھی نہیں ہوتا۔

برہان: ہو سکتا ہے کسی نے دروازے پر دستک دی ہو اور آپ نے نہ سنی ہو!

بیگم: دستک ہوتی ہی نہیں میں کیسے مان لوں۔

برہان: یعنی دستک نہیں ہوتی اور ڈاکٹر صاحب محسوس کرتے ہیں کہ دستک ہو رہی ہے۔

بیگم: جی ہاں!

(برہان چائے کے دو گھونٹ لے کر زیدی کی طرف دیکھتے ہیں۔ زیدی نے پیالی خالی کر دی ہے۔ بیگم ہاتھ بڑھا کر پیالی لے لیتی ہیں اور میز پر رکھ دیتی ہیں۔ زیدی نے اپنا سر دیوار سے لگا دیا ہے اور آنکھیں بند کیے لیٹے ہیں)

برہان: نیند آرہی ہے ڈاکٹر صاحب!

زیدی: (آنکھیں کھولے بغیر) جی نہیں۔

بیگم: آج انھیں بار بار یہی خیال آتا ہے۔ میں نے کہا بھی کہ باہر تیز ہوا چل رہی ہے اس کی وجہ سے یہ شور ہو رہا ہے مگر مانتے ہی نہیں۔ دو مرتبہ مجھے دروازے پر بھیجا ہے۔

زیدی: اور وہاں کوئی نہیں تھا۔

بیگم: کوئی بھی نہیں۔

زیدی: اچھا!

بیگم: آپ ان سے پوچھیے۔

(زیدی آنکھیں کھول دیتے ہیں)

زیدی: برہان بیٹا!

برہان: کہیے!

زیدی: یہ آج سے اٹھارہ بیس برس پہلے کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں میری پریکٹس خوب چلتی تھی۔ سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ ڈسپنسری اور گھر پر مریضوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ایک رات میں دیر سے گھر پہنچا اور پہنچتے ہی بستر پر گر پڑا...... بُری طرح تھک چکا تھا۔

(برہان پیالی میز پر رکھ دیتے ہیں۔ بیگم پیالی ہاتھ میں لیے غور سے دیکھ رہی ہے) کچھ دیر بعد میرے نوکر نے آکر بتایا کہ کوئی بڑے میاں آئے ہیں اور آپ کو ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ میں نے انکار کر دیا اور نوکر سے کہا کہ بڑے میاں کو واپس بھیج دو مگر اس کے روکنے کے باوجود وہ بوڑھا میرے کمرے میں آگیا اور منت سماجت کرنے لگا کہ میرا بیٹا سخت بیمار ہے پہلے بھی آپ کی دوا سے شفا ہوئی تھی، چل کر دیکھ لیں، مگر میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔

(زیدی دو تین لمحوں کے لیے خاموش رہتے ہیں۔ پھر کہنے لگتے ہیں)

گرم بستر چھوڑنا مشکل محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے سختی سے انکار کر دیا۔ وہ بولتا رہا اور جب نوکر نے اسے زبردستی باہر نکال دیا تو دروازے پر دستک دینے لگا۔ نہ جانے کب تک دستک دیتا رہا۔ میں سو گیا۔

(زیدی پھر خاموش ہو جاتے ہیں۔ بیگم کی نگاہیں اپنے شوہر پر جمی ہیں اور برہان میز سے دوائی کی ایک شیشی اٹھا کر اسے دیکھ رہے ہیں)

صبح اٹھا تو طبیعت پر بڑا بوجھ تھا۔ افسوس کر رہا تھا کہ میں نے بوڑھے کو کیوں مایوس کیا۔

برہان: اس وقت آپ کا ضمیر بیدار ہو گیا تھا۔

زیدی: بس یہی بات تھی، میں نے اس بوڑھے کو ڈھونڈھنے کی کوشش بھی کی مگر کہیں پتا نہ چلا۔ نہ جانے وہ کون تھا۔

برہان: وہ بوڑھا تو چلا گیا، مگر اب کبھی کبھی آپ کا ضمیر دروازے پر دستک دیتا رہتا ہے۔

(برہان بوتل میز پر رکھ دیتا ہے)

یہ دوا آج ختم ہو جانی چاہیے تھی۔

(زیدی خاموش رہتے ہیں۔ برہان برساتی اٹھا کر پہن لیتے ہیں اور بیگ اٹھا کر زیدی کی طرف دیکھتے ہیں)

ڈاکٹر صاحب!

زیدی: کہو بیٹا!

برہان: اس واقعے میں ایک بات کا اضافہ کر لیجیے۔ میں انھیں بڑے میاں کا پوتا ہوں جس کا بیٹا اس رات ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہا تھا۔

زیدی: تم!

بیگم: برہان بیٹا!

برہان: اچھا خدا حافظ! ڈاکٹر صاحب اطمینان کے ساتھ سو جایئے! اب دروازے پر دستک نہیں ہونی چاہیے۔ آرام کیجیے۔ شب بخیر۔ کل حاضر ہوں گا۔

(برہان دروازے کی طرف بڑھتا ہے اور جلدی سے پردے کے پیچھے غائب ہو جاتا ہے۔ زیدی اور بیوی خاموشی سے دیکھتے رہتے ہیں۔ برہان کے پردے کے پیچھے جاتے ہی پردہ گرتا ہے)

(اِسی پردہ)

سوالات

۱۔ ڈاکٹر زیدی دروازے پر جو دستک سنتے تھے، اس کی اصل وجہ کیا تھی؟

۲۔ ''دستک'' کے سلسلے میں ڈاکٹر زیدی اور بیگم زیدی کے درمیان جو مکالمے ہوئے، ان کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

۳۔ اس ڈرامے سے آپ کون سا اخلاقی سبق اخذ کرتے ہیں؟

۴۔ اس ڈرامے سے وہ فقرہ تلاش کیجیے جس میں اس کا مرکزی خیال پوشیدہ ہے۔

۵۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے:

تیز، مستقل، سردی، وہم، مصروف، آرام، اطمینان

۶۔ مندرجہ ذیل الفاظ ومحاورات کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

فرض شناس، نقاہت، دستک، تانتا بندھنا، سر کھجانے کی فرصت نہ ملنا، سوچ میں ڈوبنا، ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا، خیالوں میں غرق ہونا

۷۔ میرزا ادیب اردو کے نامور ڈراما نگار ہیں۔ آپ اپنی لائبریری سے اُن کی کتاب ''فصیلِ شب'' لے کر اس کا مطالعہ کیجیے۔

خط:

خط ایک طرح کی تحریری گفتگو ہے جس کے ذریعے ہم اپنے اپنے حالات سے ایک دوسرے کو آگاہ کر دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے خط کو ''نصف ملاقات'' بھی کہا جاتا ہے۔ خط نجی ہو یا کاروباری، رسمی ہو یا سرکاری ہر چند خط لکھنے کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے لیکن بالعموم مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے:۔

الف۔ خط کی پیشانی کے دائیں جانب مقامِ روانگی اور اس کے نیچے تاریخ لکھی جاتی ہے۔

ب۔ صفحے کے وسط میں طرزِ تخاطب اور بلحاظِ عمر مختصر القاب و آداب لکھے جاتے ہیں۔

ج۔ خط کا نفسِ مضمون مختصر ہونا چاہیے تاکہ اپنا اور دوسرے کا وقت ضائع نہ ہو۔

د۔ جملے چھوٹے چھوٹے اور واضح ہوں کیوں کہ لمبے جملے الجھن کا باعث ہوتے ہیں۔

ہ۔ خط کے نفسِ مضمون کے بعد قدرے بائیں جانب خط لکھنے والے کا نام اور تفصیلی پتا لکھا جاتا ہے۔

نمونے کے خطوں کے طور پر آپ مرزا غالب اور علامہ اقبالؒ کے خطوط کا مطالعہ کیجیے اور پھر اپنے دوست کو ایک خط لکھیے جس میں کسی تاریخی مقام کی سیر کا حال بیان کیجیے۔

☆☆☆☆☆

Freebooks.pk

بیگم اختر ریاض الدین

(ولادت ۱۹۲۸ء)

ہوائی

دنیا کے حسین سفر ہمیشہ مجھ پر مسلط رہے ہیں یہ ایک اور سہی۔ کچھ اتنے لمبے ہوائی سفر کا ڈر، کچھ ایک صاحب نے ڈرایا کہ ٹوکیو سے ہونولولو[1] تک نیچے بحرالکاہل ہوتا ہے اور اوپر خدا۔ کہیں زمین کا ذرا سا ٹکڑا بھی ڈھارس کے لیے دکھائی نہیں دیتا اور معمول کے مطابق اگر طوفان آجائے تو پھر الامان! سفر اللہ اللہ کرتے گزرتا ہے۔ پیٹ میں ہول اٹھے۔ لیکن میرے میاں تو تین مہینے پہلے جا چکے تھے۔ اس لیے مراجعت ناممکن تھی۔ اوکھلی میں سر دیا تو ان دھمکوں سے کیا ڈرنا۔ بوریا بستر باندھا (بستر تو ہوتا ہی نہیں یہ محاورے کی بات ہے) گھر سمیٹ کر ایک گیراج میں بند کیا۔ گھر سمیٹنے میں اب طاق ہوگئی ہوں۔ اس طرح پل بھر میں اس کی گٹھڑی باندھ کر الگ کرتی ہوں کہ گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ سب سے چھوٹی بیٹی جو اب کالج کے پہلے سال میں تھی، ساتھ ہولی۔ بڑی دولڑکیوں کے بی اے کے امتحان تھے ان کو ڈھائی مہینے بعد آنا تھا۔ کراچی پہنچ کر بی۔او۔ اے۔سی کا ٹکٹ بک کرایا۔ اس غریب لائن سے اگر جانا ہو تو ۲۴ گھنٹے کی گنجائش رکھنی چاہیے۔ اگر ۲۶ کو جانا ہو تو ۲۵ کی سیٹ بک کراؤ۔ کیونکہ وہ چودہ سو چالیس منٹ سے کم لیٹ ہونا کسرِ شان سمجھتی ہے لیکن میں پھر بھی ہمیشہ اسی ہوائی کمپنی کو چنتی ہوں، کیونکہ اس کی نشست آرام دہ ہوتی ہے اور عملہ تمیز دار۔ تو خیر ہم نے پہلی ٹھیکی کلکتہ میں لگائی۔ کلکتہ میری جائے پیدائش ہے، حالانکہ میں صرف ایک سال کی شیر خوار وہاں سے لے آئی گئی تھی لیکن پھر بھی اس جگہ سے اُنس تھا۔ اس کو دیکھنے کا ارمان تھا لیکن میرے جذبات نے مجھے ہمیشہ دھکّے کھلوائے۔ ایئر پورٹ سے لے کر پولیس اسٹیشن تک جو میرا اور باقی مجھ جیسے سیاحوں کا حال ہوا وہ ناگفتہ بہ ہے۔ خدا کسی شریف انسان کو کلکتے[2] نہ لے جائے۔ اگر مرزا غالب نے اس میں کچھ دیکھا تو ہندوستانی کسٹم آفیسر اور بنیا پولیس سے پہلے دیکھا ہوگا۔ قصہ کوتاہ ہم نے جلدی سے اپنی جان چھڑائی اور ہانگ کانگ[3] روانہ ہوئے۔ وہاں جا کر روح خوش ہو جاتی ہے۔ تازہ دم ہو کر ٹوکیو روانہ ہوئے۔ راستہ سخت طوفانی تھا۔ کمبخت ''پین ایم''[4] پرانا کھٹارا جہاز چار گھنٹے لرزتا رہا اور ہمیں لرزاتا رہا۔ ساتھ بیٹھا جاپانی تاجر تسلی دیتے ہوئے بولا: ''یہ تو کچھ بھی نہیں۔ جب ٹوکیو سے ہوائی جاؤ گی تو ہوائی جہاز ایسے اچھلے گا جیسے چھاج میں گیہوں۔'' ہم نے انا للہ پڑھ لیا اور ارادہ کر لیا کہ میاں کو ہوائی میں ہی رہنے دیں اور ہم ٹوکیو میں ان کی واپسی کا انتظار کریں، لیکن خاک چھاننے کا شوق خوف وخطر پر غالب آ گیا اور جنرل شیخ اور بیگم شیخ کی خاطر مدارات کا مزا چکھ کر، دو دن ٹوکیو ٹھہر کر جل تو جلال تو کہتے ہوئے جاپان ایئر لائنز میں بیٹھ گئے۔ ہوائی جہاز

---

1. HONO LULU (ہوائی کا دارالحکومت) 2. نیا نام کول کتہ 3. Hong Kong 4. Pan Am

چلا تو ہم نے اللہ سے گڑگڑا کر دعا مانگی کہ یارب ہماری عزت رکھ لے اور خیر سے سفر پورا کردے۔ میرے مولا نے میری مراد ایسی پوری کی کہ سارا سفر آسمانوں میں ریشم کی طرح سرسر کرتا گزر گیا۔ میں نے اتنے خوش گوار چھ گھنٹے کبھی نہیں گزارے تھے۔

رات کو ساڑھے دس بجے ہمارا جہاز ہوائی کے دارالسلطنت ہونولولو میں اترا۔ میاں کو تار دے دیا تھا۔ اُمید تھی کہ ہوائی اڈے پر ہار لے کر پہنچیں گے۔ جزیرہ ہوائی کی یہ ایک رسمِ دیرینہ ہے کہ ہر آنے والے کا پھولوں کے حسین گجروں سے استقبال کیا جاتا ہے، اس لیے ارمان تھا کہ کم از کم میاں تو پھول نچھاور کرنے پہنچ جائیں گے، لیکن میاں ریاض الدین صاحب حسبِ معمول غائب، رات کا وقت، مجھے ان کا پتا بھی نہیں معلوم۔ جناب بلی کی طرح تین گھر تبدیل کر چکے تھے۔ ہوائی کی یونیورسٹی میں فون کیا تو انھوں نے کہا، ایسٹ ویسٹ سنٹر[1] سے پوچھو۔ اتنے میں ایک ٹیکسی والا آگے بڑھا، میں وہاں تک آپ کو لے جاتا ہوں، باقی پھر دیکھا جائے گا۔ ہائی رائز ہوسٹل[2] تک پہنچے تو اونچی اونچی عمارات، بتیاں جل رہی ہیں، طلبہ پڑھ رہے ہیں لیکن ہمارے میاں ندارد۔ غصہ اور پریشانی دونوں مل گئے۔ یہ اچھا استقبال ہو رہا ہے۔ رات کے بارہ بجے! تین مہینے بعد بیوی آئی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اتنے میں ایک کار لڑکیوں سے لدی پھندی، چیختی چلاتی آن کر رکی۔ انجان شکلوں نے میرے گلے میں ہار ڈالے۔ پیچھے ایک اور کار اس میں گٹار پر کچھ نوجوان ہوائی کے گیت گاتے ہوئے اترے اور ان نوجوانوں میں چھپے ہوئے میاں ریاض الدین مسکراتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں حسبِ معمول برستی، ان کی سہیلیوں نے سمجھایا کہ تار پڑھنے میں غلط فہمی ہوگئی۔ ہوائی کا وقت جاپان کے وقت سے ۲۴ گھنٹے پیچھے ہے اس لیے اکثر تاریخوں میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ ہم نے جل کر کہا کہ اصل گڑبڑ تو ہماری شادی کی تاریخ سے شروع ہوئی تھی، بہرحال خدا کا شکر ادا کیا، ٹیکسی والے کا شکریہ ادا کیا۔ پھر گھر روانہ ہوئے۔

مجھے گھر دیکھنے کا شوق لیکن ریاض صاحب ٹالتے جائیں کہ تم صبح آرام سے دیکھنا۔ ابھی کمروں میں بتی مت جلاؤ اور اس کی وجہ سمجھ میں آئی جب گھر کے ہر کونے میں منوں کوڑا اور گرد و غبار دیکھا۔ ہر دراز سے میلے موزے اور رومال، ہر جیب سے تھیٹر، سینما فلور شو کی پرچیاں اور ریزگاری، پینٹری[3] میں پانچ دن سے برتن بغیر دھلے پڑے تھے۔ میاں بجائے برتن دھونے کے نئے برتن نکال نکال کر استعمال کرتے جاتے تھے۔ اس طرح درجنوں موزے، رومال، بنیان خرید ڈالے تاکہ پرانے دھونے نہ پڑیں۔ بہرحال رات کو دو بجے تک اودھم مچتا رہا، پھر ہمسائے کی گرج دار آواز آئی: ''خاموش!'' ہم عموماً ہمسائے کی بات نہیں سنتے۔ لیکن یہ ہمسایہ ہوائی کا مشہور پہلوان اور ہیوی ویٹ چیمپئن تھا اور نام بھی تھا ہارڈ بائلڈ ہیگرٹی[4] اس لیے اس کی ایک تنبیہ ہی کافی تھی۔ دو منٹ کے اندر سب لڑکے لڑکیاں غائب، خیر ہم تھکے ہارے سو گئے۔ واللہ اعلم کب اٹھے، میاں

---

۱ East West Center ۲ High Rise Hostel ۳ Pantry ۴ Hard Bioled Haggerty

دفتر جا چکے تھے۔ ناشتا خود بنایا زندگی میں پہلی دفعہ خود کھانا پکانا تھا، اس لیے کام کا پتا ہی نہ چلا۔ اب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوا۔ میری بیٹی ناز اور میں نے کمر کس کر سارا دن گھر کی صفائی کی اور لنچ قریبی ہوٹل میں جا کر کھایا۔ رات کو بھی کچھ نہ پکایا۔ جالے، چیونٹیاں اور گرد ہٹا ہٹا کر کمر دکھ رہی تھی۔ یہ جومیاں کی سات پشتوں پر احسان کیا تھا۔ شام کو ہم جزیرے کا اولین معائنہ کرنے کار میں گئے۔ ڈھلتے سورج میں بحرالکاہل کروٹیں بدل رہا تھا اور چاروں طرف زمرد کی آمریت مستحکم ہو چکی تھی۔ تاحدِ نظر سبزہ ہی سبزہ، یوں احساس ہوا کہ جزیرے اوواہو[1] میں کُہنہ مشق کائنات نئے سرے سے شباب پر آئی ہے۔ اس کے ننھے منے رقبے میں فطرت کا ہر رنگ ہر انگ پایا جاتا ہے۔ سمندر یہاں عمیق تر ہوتا چلا گیا ہے۔ یہ جنوبی یورپ کے آبی کناروں سے زیادہ نیلا اور چمکیلا ہے۔ دوپہر کے وقت اس نیلم کی بھڑک آنکھیں خیرہ کر دیتی ہے۔ میں نے وجدانی حسن میں اس طرح ڈوبے ہوئے ساحل بہت کم دیکھے ہیں۔

یہاں کے کوہساروں نے اس جزیرے کے گول چہرے کو ایک نیا زاویہ بخشا ہے۔ یہ کہیں سنگلاخ ہیں اور کہیں اتنے سبز کہ ازلی برساتوں کا زرین بسیرا معلوم ہوتے ہیں۔

اگلے دن ہم سب نے ہنومابے پر پک نک منائی۔ یہ جگہ مجھے ایسی بھائی کہ دوڑی چھوٹی ادھر ہی کا رخ کرتی تھی۔ یہاں پانی سب سے مہذب اور شفاف تھا۔ یہ ساحل آبی مخلوق کے لیے مشہور تھا اور ہوائی کی یونیورسٹی دنیا بھر میں علومِ سمندر[2] میں سبقت لے گئی ہے۔

غرض یہ کہ اوّل تو قدرت نے اپنے حسن کے لنگر یہاں جاری کر دیے تھے، جو کچھ کمی تھی وہ انسان نے پوری کر دی۔ اس شام ہم گھر کا سارا سودا لینے سُپر مارکیٹ گئے۔ بہت سے صاحبان اس ادارے کو جانتے ہیں لیکن بہت سی میری ہم وطن بہنیں اس کے متعلق جاننا چاہیں گی۔ تو سنیے سپر مارکیٹ امریکن سرمایہ داری کا مکمل مظاہرہ اور امریکن طرزِ حیات کا بنیادی قلعہ اور اس کی لامحدود افراط کا ذخار ہے۔ جب سے یہ بروئے زمین بر سرِ پیکار رہا، ننھی ننھی دکانیں اور چھوٹے بساطی پنساری دیوالیہ ہو گئے۔ یہ سپر مارکیٹ دس بازاروں کا مہا گرو ہے۔ ساری انارکلی اور مال روڈ کی دکانوں کا سامان اس کی ایک پلیٹ میں سما جائے۔ آپ جب داخل ہوں تو فوراً چار پہیوں والی ٹرالی ساتھ لے لیں کہ ہفتے دو ہفتے کا راشن اس میں ڈالتی جائیں اور جب خود چلتے چلتے تھک جائیں تو اس میں بیٹھ جائیں اور کسی اور سے کہیں کہ آپ کو کھینچے۔ صرف یہ آخری نصیحت میری اختراع ہے، ورنہ درحقیقت سپر مارکیٹ ایسی شیطان کی آنت ہے کہ دل چاہتا ہے کہ خود ٹرالی میں لٹک جائیں۔ اس ادارے کی افراط دیکھ کر انسان ایشیا، افریقہ کی بھوک اور قحط بھول جاتا ہے۔ اس جگہ بلا ارادہ اور بلا ضرورت

---

1. Oaho　2. Oceanography

خریداری کرنی پڑتی ہے۔ ہر شے کی پچاس قسمیں اور ہر قسم چھت تک چنی ہوئی۔ ہر دوسرے قدم میں سیل[1] لکھا ہوا۔ اگر نقد نہیں تو ادھار لیجیے۔

سپر مارکیٹ میں جا کر عورت کی آنکھیں اور بٹوے کھل جاتے ہیں۔ میں نے پہلے ہی ہلے میں ۳۲ ڈالر کی کھانے پینے کی چیزیں لے لیں۔ کار بھر گئی۔ اس مارکیٹ میں الگ نرسری بھی ہوتی ہے، جہاں عورتیں اپنے بچے چھوڑ کر اطمینان سے شاپنگ کرتی ہیں۔

میاں نے ہمارے پیچھے کچھ گھر کا سامان مثلاً سیکنڈ ہینڈ کار، ٹیلی وژن، صوفہ، گراموفون، ٹیپ ریکارڈر اور باغ کی ہلکی کرسیاں وغیرہ خرید رکھا تھا۔

اتنا سلیقہ میرے میاں میں کہاں سے آ گیا۔ مجھے نہیں معلوم۔ لیکن یہ سب ایک دکان کے توسّل سے ہوا ہے جو غریبوں، مفلوجوں اور یتیموں کے لیے چلائی گئی تھی۔ اس لیے میرے میاں نے خیرات کے جذبے میں اپنے گھر کو پھٹیچر فرنیچر سے بھر لیا۔ کار ۱۹۵۷ء کا ماڈل تھی۔ جب چلتی تو دنیا دیکھتی تھی اور جب رکتی تو دنیا شکر کرتی تھی۔ اس کے پراسرار پٹاخے نہ معلوم کہاں سے چھوٹتے تھے، ہم نے جاتے ہی کام بانٹ لیے، میں کھانا پکاؤں گی، بیٹی صفائی کرے گی۔ میاں بولے، ہم تمھاری ڈرائیوری کریں گے۔ ہم لاجواب ہو گئے۔ اس لیے کوئی اور کام ان کو نہ دیا کیونکہ اس کار کو چلانا انھی کا کام تھا۔ میں باہر ملک میں اگر کار چلاؤں تو کم سے کم مانوس ڈھانچہ تو ہو۔ اس کم بخت کے گیئر کدھر اور بریک کدھر۔ بالکل بے سروپا۔ لیکن شاباش ہے اس کار پر کہ ہزاروں میل سیریں کیں لیکن اس نے ایک دفعہ بھی دغا نہ دی۔ پرانا ٹیلی وژن کچھ ایسا برا نہ تھا۔ دو دھپ لگاؤ یا گرم کمبل ڈالو تو اس کے کالے سفید ترمرے ناچنے بند ہو جاتے تھے۔ پھر گھنٹوں صحیح چلتا تھا جب تک کہ چینل نہ بدلو۔ چینل بدلی اور پھر وہی دھمو کے تھپڑ، گرم پانی کی بوتل، وہ پھر چل پڑا۔

تو صاحب یہ تو ہوائی کا ازدواجی رخ تھا۔ اب تک گرہستن ماں، بیوی، بول رہی تھی۔ لیکن یہ گرہستن ماں بیوی دو وقت بلکہ اگلے دو دن کا اکٹھا کھانا پکا کر ریفریجریٹر میں بھر کر آزادی کا سانس بھی لیتی تھی۔ جگہ جگہ سیر پر خود نکل جاتی تھی۔ لائبریریوں سے گود بھر بھر کر جزائر ہوائی بلکہ سارے بحرالکاہل کے جزائر پر کتابیں لاتی تھی۔ آہستہ آہستہ لوگوں سے ملاقات، پروفیسر صاحبان سے گفتگو، سیاحوں اور طلبہ سے میل جول، بہت اچھا وقت گزرا۔ ہونولولو کے مختلف مدارج ابھرنے شروع ہوئے۔ اس کی ہمہ گوں زندگی کی چاشنی کا چسکا لگ گیا۔

ہوائی میں امریکہ کی فیڈرل حکومت[2] نے ایک عظیم الشان مرکز کھولا ہے جسے "ایسٹ ویسٹ سنٹر" کہتے ہیں۔ اس کی حسین حدود اور عمارات میں مغرب اور مشرق کے عالم مدعو کیے جاتے ہیں۔ جو سینئر سکالر[3] کہلاتے ہیں۔ وہ مرکز کے

۱۔ Sale　۲۔ Federal Government　۳۔ Senior Scholar

خرچ پر آتے ہیں۔ ہزار بارہ سو ڈالر کا وظیفہ ہر مہینے پاتے ہیں۔ اس ننھے سے وظیفے میں ایک خاندان ٹھاٹ کر سکتا ہے۔ دس مہینے یا سال کورس کی میعاد ہوتی ہے۔ اس دوران میں جو مرضی آئے کیجیے، پڑھیے لکھیے، ریسرچ کیجیے، تاثرات قلمبند کیجیے، کوئی پابندی نہیں، کوئی امتحان نہیں، کوئی کلاس نہیں، کوئی وقت نہیں۔ میرے میاں اس آزادی پر مگن تھے۔ آپ کا آرام دہ کمرہ، ٹائپ رائٹر، غسل خانہ، بہترین لائبریری، ساتھ ہی سستا اور مزے کا ریستوران، ارد گرد لڑکے، لڑکیاں، آزادی کی فضا اکثر عالم سگریٹ کا دھواں اور غپ اڑاتے پائے جاتے تھے لیکن کوئی رپورٹ کرنے والا نہیں تھا۔ کچھ عالم کتابیں بھی لکھ جاتے ہیں جو یہ مرکز بہت فخریہ شائع کرتا ہے۔

ہاں تو ایسٹ ویسٹ سینٹر اور ہوائی کی یونیورسٹی میں یوں تو ارضی قربت ہے لیکن ازلی رقابت بھی ہے۔ کسی حد تک یہ رقابت صحت مند بھی ہے۔ امریکہ کے بہترین پروفیسر اور اعلیٰ ذہن سردی گرمی لیکچر کے لیے بلائے جاتے ہیں۔ طرح طرح کی نمائشیں، فلم، جشن منائے جاتے ہیں۔ اس کی جدید عمارات کے سامنے لمبی سے لمبی موٹریں جو آدھی طلبہ کی اور آدھی پروفیسروں کی ہوتی ہیں، امریکہ کی افراط کا صحیح ثبوت ہیں۔

اس مغرب و مشرق کے مرکز کا ایک جاپانی باغ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ اتنا ''ایمان شکن'' ہے کہ میں اکثر لائبریری جاتے جاتے اس میں گھس جاتی تھی۔ جزائرِ ہیٹی کے پھول خصوصاً گارڈینیا، زرد چنبیلی، کنول، کچا کچا سبزہ، نڈھال پانی اور رنگین مچھلیاں اور اس کی پشت پر متنوع درختوں کا ذخیرہ۔

اس ایسٹ ویسٹ سینٹر کے علاوہ یونیورسٹی کا میلوں میں پھیلا ہوا احاطہ بھی ایک دیدہ زیب سبزہ زار ہے۔ ہر قدم پر گل آویزاں روشیں اور بتدریج باڑیں، لیکن اس کے علاوہ جو سب سے دل پذیر عنصر اس فضا میں پایا جاتا تھا وہ تھا بین الاقوامی طلبا کا ربط ضبط۔ جنوبی بحرالکاہل سے لے کر جاپان، انڈونیشیا، برما، ملایا، فلپائن، کوریا، ویتنام، فجی کے جزائر، آسٹریلیا، پاکستان، ہندوستان، یورپ اور امریکہ کے جواں سال جویندگانِ علم، یہ معاشرتی تنوع بھی ایک تعلیمی حیثیت رکھتا تھا۔

(دھنک پر قدم)

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کیجیے:

الف۔ نیچے بحرالکاہل ہوتا ہے اور اوپر خدا، کہیں زمین کا ذرا سا ٹکڑا بھی ڈھارس کے لیے دکھائی نہیں دیتا۔

ب۔ اگر ۲۶ کو جانا ہو تو ۲۵ کی سیٹ بُک کراؤ کیونکہ وہ چودہ سو چالیس منٹ سے کم لیٹ ہونا کسرِ شان سمجھتی ہے۔

ج۔ خدا کسی شریف انسان کو کلکتے نہ لے جائے۔ اگر مرزا غالب نے اس میں کچھ دیکھا تو ہندوستانی کسٹم آفیسر اور بنیا پولیس سے پہلے دیکھا ہوگا۔

د۔ جب ٹوکیو سے ہوائی جاؤ گی تو ہوائی جہاز ایسے اچھلے گا جیسے چھاج میں گیہوں۔

ہ۔ سارا سفر آسمانوں میں ریشم کی طرح سرسر کرتا گزر گیا۔

و۔ ڈھلتے سورج میں بحرالکاہل کروٹیں لے رہا تھا اور چاروں طرف زمردی آمریت مستحکم ہو چکی تھی۔

ز۔ سپر مارکیٹ امریکن سرمایہ داری کا مکمل مظاہرہ اور امریکن طرزِ حیات کا بنیادی قلعہ اور اس کی لامحدود افراط کا ذخار ہے۔

۲۔ درج ذیل محاورات اور ضرب الامثال کو جملوں میں استعمال کیجیے:

اوکھلی میں سر دیا تو دھمکوں سے کیا ڈرنا، دھکے کھانا، اِنّا لِلّٰہ پڑھنا۔ خاک چھاننا، بلی کی طرح گھر بدلنا، شیطان کی آنت ہونا، پیٹ میں ہول اٹھنا، ٹھیکی لگانا، آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہونا، پھول نچھاور کرنا

۳۔ ''سفرنامے کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کو معلومات اور تفصیل اس طرح مہیا کرے کہ پورا ماحول سمجھ میں آجائے۔'' آپ نے اپنے ملک میں یا ملک سے باہر کسی جگہ کا سفر کیا ہو تو اس کا حال اپنے لفظوں میں لکھیے۔

۴۔ درج ذیل مصادر کو امدادی افعال کے طور پر اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

دینا، چکنا، آنا، جانا، اٹھنا، رہنا، ہونا، کرنا، لینا، چاہنا، رکھنا

۵۔ درج ذیل الفاظ کا تلفظ اعراب کی مدد سے واضح کیجیے:

الامان، مراجعت، شیرخوار، ذخار، اختراع، توسل، تنوع، واللہ اعلم

۶۔ بیگم اختر ریاض الدین کا مشہور سفرنامہ ''سات سمندر پار'' اپنے کالج کی لائبریری سے لے کر پڑھیے۔

آپ بیتی:

اپنی ذاتی سرگذشت یا ذاتی احوال و واردات کا تحریری بیان آپ بیتی یا خودنوشت کہلاتا ہے۔ انگریزی میں اسے آٹو بائیوگرافی کہتے ہیں۔

کسی جان دار چیز کی آپ بیتی ہو یا کسی بے جان شے کی، اس کے اہم اصول یہ ہیں:

الف۔ آپ بیتی میں واحد متکلم کا صیغہ (میں) استعمال کیا جاتا ہے۔

ب۔ آپ بیتی لکھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا مشاہدہ اور مطالعہ بڑا گہرا ہو اور فرضی واقعات اور نقل پر بھی اصل کا گمان ہو۔

ج۔ واقعات اور حالات میں ایک منطقی ربط اور تسلسل ہو اور زبان روزمرّہ گفتگو کے عین مطابق ہو۔

مندرجہ بالا باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اب آپ ایک دس روپے کے بوسیدہ نوٹ کی آپ بیتی لکھیے۔

☆☆☆☆☆

Freebooks.pk

چراغ حسن حسرت

(۱۹۰۲ء۔ ۱۹۵۵ء)

مولانا ظفر علی خاں

اب سے کوئی دس سال اُدھر کا ذکر ہے کہ میں اخبار ''نئی دنیا'' کے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اتنے میں کسی نے آ کے کہا کہ ''جمیندار صاحب آئے ہیں'' میں لنگی باندھے بیٹھا تھا۔ سر کے بال پریشان، ڈاڑھی کئی دن کی بڑھی ہوئی، ''جمیندار'' کا نام سنتے ہی ہڑ بڑا کے اُٹھا، پوچھا ''کون جمیندار صاحب؟'' وہ بے چارا کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ مولانا شایق احمد عثمانی آئے اور کہنے لگے: ''بھئی، مولانا ظفر علی خاں آئے ہیں۔'' چچا صدیق انصاری نے، جو اپنے گدیلے پر بیٹھے پانوں کی جُگالی فرما رہے تھے، انگڑائی لی اور نیم باز آنکھوں سے، ادھر اُدھر دیکھ کر ایک اور گلوری کلے میں دبالی۔ ان دنوں ''نئی دنیا'' کا دفتر چونا گلی میں ہوا کرتا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ باہر ایک طرف عصر جدید پریس، دوسری طرف حکیم غلام مصطفٰی کا مطب۔ دروازے سے اندر گھسو تو داہنی طرف نئی دنیا آباد تھی اور بائیں طرف مولانا شائق احمد عثمانی نے پرانی دنیا بسا رکھی تھی، یعنی اپنے اہل وعیال اور عربی کی بھاری بھرکم کتابوں سمیت رہتے تھے۔ میں اس نئی دنیا کا کولمبس[1] تھا اور مقالہ افتتاحیہ کے جہاز کے ساتھ ساتھ فکاہات کی کشتی بھی چلاتا تھا، افسوس کہ یہ محفل سال بھر کے اندر اندر برہم ہوگئی، نہ نئی دنیا رہی نہ پرانی دنیا، رہے نام اللہ کا۔

تھوڑی دیر میں مولانا ظفر علی خان کھٹ کھٹ کرتے تشریف لائے۔ میں نے اُنھیں اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ تصویریں ضرور دیکھی تھیں لیکن تصویروں سے کسی شخص کی صورت شکل کے متعلق صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا، بہرحال اتنا تو یقین تھا کہ ان کی توند تو ضرور بڑھی ہوئی ہوگی۔ آخر جب معمولی کارکنوں کا قبہ شکم گنبد فلک سے ہمسری کرتا ہے تو مولانا ظفر علی خاں کو، جنھیں آل انڈیا لیڈر کی حیثیت حاصل ہے، ایک عدد گرانڈیل توند کا مالک ہونا چاہیے لیکن اُنھیں دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ توند نہ عمامہ، آخر یہ کیسے مولانا اور کیسے لیڈر ہیں؟ یہ راز لاہور آ کے کھلا کہ مولانا توند سے کیوں محروم رہے؟

غرض مولانا تشریف لائے اور آتے ہی سائمن کمیشن، ہندوستان کی جدید اصلاحات، راؤنڈ ٹیبل کانفرنس اور کامل آزادی کا قصہ چھیڑ دیا۔ مولانا شائق احمد عثمانی ان دنوں کانگرس سے باغی ہو چکے تھے اور سائمن کمیشن سے تعاون کے حامی تھے۔ اُن سے اس مسئلے پر بحثیں رہتی تھیں۔ اب مولانا نے یہ حکایت شروع کی تو پھر یہی بحث چھڑ گئی لیکن دراصل مجھے اس بحث سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔

مولانا کے نزدیک آئینی کمیشن کا ہندوستان آنا بہت اہم واقعہ تھا اور ہمارے نزدیک مولانا ظفر علی خاں کا کلکتے

---

[1] مصنف ''کولمبس'' اور ''سندباد جہازی'' کے قلمی ناموں سے فکاہیہ کالم لکھا کرتے تھے۔

تشریف لانا بہت زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ اب کھینچا تانی شروع ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ مولانا شعروشاعری کی طرف آئیں اور مولانا ہم سب کو سیاست کی طرف کھینچے لیے جاتے تھے۔ میں نے غالبؔ کا نام لیا، مولانا نے برکن ہیڈ کا ذکر شروع کر دیا...... بس اب یہ کیفیت تھی کہ میں اُنھیں میرؔ کی طرف لاتا ہوں اور وہ مجھے بالڈوِن کی طرف لیے جاتے ہیں، میں کہتا ہوں غالبؔ، وہ فرماتے ہیں سائمن، غرض دیر تک یہی جھگڑا رہا، آخر مولانا کو فتح ہوئی، یعنی ہم نے مجبوراً شعروادب کا پنڈ چھوڑا اور خاموشی سے اُن کی باتیں سننے لگے۔

میں لاہور آیا تو کچھ دنوں زمیندار کے دفتر میں بھی قیام رہا۔ ایک رات کا ذکر ہے کہ کسی نے پچھلے پہر میرا شانہ ہلایا۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ لیکن ابھی صبح کاذب تھی، ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ کوئی شخص میرے سرہانے کھڑا ہے، میں گھبرایا کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے، اتنے میں مولانا کی آواز آئی کہ اٹھو میرے ساتھ سیر کو چلو۔ میں سمجھ گیا کہ مولانا سیر کو جارہے ہیں اور مجھے شرفِ رفاقت بخشنا چاہتے ہیں، لیکن خدا بھلا کرے قاضی احسان اللہ مرحوم کا، اُنھوں نے مجھے پہلے ہی بتا رکھا تھا کہ اگر مولانا تمھیں اپنے ساتھ سیر کو لے جانا چاہیں تو ہرگز نہ جائیو، میں نے پوچھا، یہ کیوں؟ کہنے لگے وہ تو پچھلے پہر اٹھ کر نہر کے کنارے میلوں دوڑتے ہی چلے جاتے ہیں، پھر ڈنٹر پیلتے ہیں، تم ساتھ گئے تو تمھیں بھی دوڑائیں گے اور جب تم نڈھال ہو جاؤ گے تو اپنے ساتھ نماز پڑھائیں گے۔ اب جو مولانا نے ساتھ چلنے کو کہا تو قاضی صاحب کی نصیحت یاد آگئی اور آنکھوں تلے موت کا نقشہ پھر گیا۔ میں نے نہایت مضمحل آواز میں کہا کہ ”مولانا! میں تو...... میں تو سخت بیمار ہوں۔ رات بخار ہو گیا تھا۔ اب سر میں سخت درد ہے۔ پیٹ میں بھی درد ہو رہا ہے۔ غالباً قولنج[1] ہے۔ مجھے پہلے بھی یہ مرض ہو چکا ہے...... ہائے اللہ“ یہ کہہ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ مولانا نے مجھ سے ہمدردی ظاہر کی۔ علاج کے متعلق چند معقول مشورے دیے اور تشریف لے گئے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور جی میں تہیہ کر لیا کہ اب دفتر میں نہیں رہوں گا۔ اب یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ مولانا توند سے کیوں محروم ہیں۔

آگے چل کر معلوم ہوا کہ انھیں صرف دوڑنے اور ڈنٹر پیلنے کا ہی شوق نہیں، مگدر بھی ہلاتے ہیں، نیزہ بازی اور شہسواری میں بھی برق ہیں، پیراکی اور کشتی گیری میں بھی بند نہیں، نشانہ بھی اچھا لگاتے ہیں۔ حیدرآباد کی ملازمت کے زمانے میں کچھ دن فوج میں بھی رہے۔ یہ قصہ عجیب ہے، سپاہی نیزہ بازی کے کرتب دکھا رہے تھے ان کی بھی طبیعت لہرائی۔ گھوڑے پر سوار ہو کے نیزہ تانا اور آن کی آن میں میخ اکھیڑ لی۔ ہر طرف سے تحسین و آفرین کا غلغلہ ہوا اور ان کی خدمات فوج کے صیغے میں منتقل کر دی گئیں، لیکن افسر الملک سے نباہ نہ ہو سکا، اس لیے استعفا دے دیا۔

ایک مرتبہ ایک صاحب کہنے لگے کہ مولانا ظفر علی زبان اور محاورے کے استاد ہیں۔ اشعار کی بندش خوب ہوتی

---

[1] ایک شدید درد جو قولون Colon (بڑی آنت) میں ہوتا ہے انگریزی میں اسے Appendicitis کہتے ہیں۔

ہے لیکن ان کے ہاں حقیقی شاعری بہت کم ہے۔ میں نے کہا ذرا بحیرۂ قلزم، لندن کی ایک صبح، رامائن کا ایک سین، پڑھ کر دیکھیے۔ کہنے لگے، ''میں نے تو یہ نظمیں نہیں پڑھیں لیکن مولانا کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا قلب عشق و محبت کے لطیف جذبات سے خالی ہے۔'' میں نے گفتگو کا پہلو بدل کر شعر خوانی شروع کر دی۔ پہلے فارسی کے ایک دو شعر سنائے۔ جب وہ جھومنے لگے تو شاد کا یہ شعر پڑھا۔

دیکھا کیے وہ مست نگاہوں سے بار بار
جب تک شراب آئی کئی دور ہوگئے

انھوں نے دو تین مرتبہ یہ شعر پڑھوایا۔ میں نے پھر کہا۔

سلیقہ مے کشی کا ہو تو کر سکتی ہے محفل میں
نگاہِ مستِ ساقی مفلسی کا اعتبار اب بھی

وہ شعر سن کر تڑپ گئے۔ کہنے لگے ''کس کا شعر ہے؟'' میں نے پوچھا ''جو شخص ایسا شعر کہہ سکتا ہے اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟'' کہنے لگے ''اس کے شاعر ہونے میں کیا شک ہے۔'' میں نے کہا'' تو پھر سن لیجیے کہ یہ شعر مولانا ظفر علی خاں کا ہے۔'' یہ سن کر ان کا اوپر کا سانس اوپر اور تلے کا تلے رہ گیا۔

دراصل مولانا کی شاعری پر تنقید کرنا میرا موضوع نہیں۔ یونہی برسبیلِ تذکرہ یہ باتیں آگئیں۔ مجھے تو یہ کہنا ہے کہ مولانا نے اپنی تمام نظمیں بہت تھوڑے وقت میں کہی ہیں۔ شاید ہی کوئی نظم ایسی ہو جو انھوں نے گھنٹے دو گھنٹے میں کہی ہو، ورنہ ایک نظم پر عموماً آدھ گھنٹے سے زیادہ وقت صرف نہیں ہوتا۔ ''پتھر نکال۔ ہمسر نکال'' بڑے معرکے کی نظم ہے۔ سترہ شعر ہیں جو گھنٹے بھر میں لکھے گئے ہیں۔ اس کا آخری شعر مجھے نہیں بھولتا۔

تو غزل خوانی پہ آجائے تو ہے خواجوئے وقت
زلفِ عنبر بار سے کژدُم بکھیر اَژدر نکال

ہم نے اکثر شاعروں کو دیکھا ہے کہ شعر کہنا چاہتے ہیں تو شفا الملک حکیم فقیر محمد صاحب چشتی سے رجوع کرتے ہیں اور ہفتے بھر کا مُسہل لے لیتے ہیں اور پھر فی یوم ایک شعر کے حساب سے کہتے چلے جاتے ہیں، یہ نہیں کرتے تو بیوی کو پیٹتے ہیں یا اس سے پٹتے ہیں، بچوں کو جھڑکتے ہیں، ذرا گھر میں شور ہوا اور وہ سر کے بال نوچنے لگے۔ ''ہائے عنقائے مضمون دام میں آ کے چلا گیا۔ کم بختو! ملعونو! تمھارے شور نے اسے اڑا دیا۔'' مولانا ظفر علی خاں کا یہ حال نہیں، جس طرح ہم اور آپ نثر لکھتے ہیں اسی طرح وہ شعر کہتے چلے جاتے ہیں۔

مولانا جب تک دفتر میں رہتے تھے بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ نظم لکھی اور پکار کے کہا کہ ''بلاؤ قاضی کو، بلاؤ اختر کو، کہاں ہے زاہدی، کہاں ہے حسرت؟'' سب جمع ہوئے اور مولانا نے نظم پڑھ کے سنائی اور پھر انھیں نت نئی تجویزیں

سوجھتی رہتی تھیں جو دو تین دن کے چرچے میں غائب غلّہ ہو جاتی تھیں۔ ہم میں سے کوئی اچھا شعر کہتا یا کوئی اچھا مضمون لکھتا، تو تعریف کر کے دل بڑھاتے اور انعام بھی دیتے۔ ایک مرتبہ راقم نے فکاہات لکھے، بہت خوش ہوئے، بٹوا نکال کے دے دیا اور کہنے لگے: ''اس میں جو کچھ ہے لے لو۔'' لیکن اکثر لوگ پھر بھی دعائیں مانگتے رہتے تھے کہ اللّٰہ کرے مولانا کہیں دور چلے جائیں اور عموماً یہ دعائیں قبول ہی ہوتی تھیں۔

اصل میں مولانا کو اخبار کی زبان اور کتابت کی صحت کا بڑا خیال رہتا تھا۔ کاتبوں کی جان الگ آفت میں، ایڈیٹر الگ مصیبت میں مبتلا، جب تک مولانا دفتر میں ہیں، غل غپاڑا مچا ہوا ہے۔ جوں ہی کاپی پر نظر پڑی شور مچ گیا۔ ''ارے یہ کیا کیا؟ یہ عبارت تو بالکل مہمل ہے۔ اس مراسلے کی تصحیح نہیں ہوئی، یوں ہی کاتب کو دے دیا گیا ہے۔ خبروں کی عبارت چست نہیں۔ کتابت کی غلطیاں تو دیکھو، ایک کالم میں پچاس پچاس غلطیاں اور کتابت کیسی عجیب ہوئی ہے، کوئی دائرہ بھی تو صحیح نہیں، غضب خدا کا، قرآن کی آیت غلط لکھ دی، اتنا خیال نہ آیا کہ کلامِ الٰہی ہے، ستیاناس کر دیا اخبار کا، ان تمام کاپیوں کو جلا دو، از سرِ نو اخبار مرتب نہیں ہوسکتا، اعلان کر دو کہ کل اخبار نہیں نکلے گا۔ بلاؤ اختر کو، اختر! اختر کہاں ہے؟ کہاں ہے قاضی؟ قاضی! بند کر دو جی اخبار کو! بند کر دو! میں یوں اخبار نہیں نکالنا چاہتا......''

(مردمِ دیدہ)

سوالات

ا۔ مختصر جواب لکھیے:

الف۔ کیا سبب تھا کہ مولانا توند سے محروم تھے؟

ب۔ صبحِ کاذب کے وقت مولانا ظفر علی خاں کے معمولات کیا تھے؟

ج۔ مصنف صبح کے وقت مولانا کے ساتھ سیر پر جانے سے کیوں گریزاں تھے؟

د۔ سبق میں مولانا کی کن کن نظموں کا ذکر آیا ہے؟

ہ۔ مولانا ظفر علی خاں شعر یا نظم کہنے میں کتنا وقت صرف کرتے تھے؟

و۔ مصنف کے خیال میں عام شاعر حضرات شعر کہنے سے پہلے کیا انداز اختیار کرتے ہیں؟

ز۔ مولانا ظفر علی خاں اپنے اخبار میں لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کس طرح کرتے تھے؟

ح۔ کتابت اور زبان کی غلطیاں اور کمزوریاں دیکھ کر مولانا کس ردِعمل کا اظہار کرتے تھے؟

۲۔ مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت اپنے الفاظ میں کیجیے:

الف۔ اپنے گدیلے پر بیٹھے پانوں کی جگالی فرما رہے تھے۔

ب۔ قُبّۂ شکم گنبدِ فلک سے ہمسری کرتا ہے۔

ج۔ آنکھوں تلے موت کا نقشہ پھر گیا۔

د۔ ہر طرف سے تحسین و آفرین کا غلغلہ بلند ہوا۔

ہ۔ نیزہ بازی اور شہسواری میں بھی برق ہیں۔

و۔ یہ سن کر اُن کا اوپر کا سانس اوپر اور تلے کا تلے رہ گیا۔

ز۔ ہائے عنقائے مضمون دام میں آ کے چلا گیا۔

۳۔ مندرجہ ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے:

محفل برہم ہونا، کھینچا تانی ہونا، پنڈ چھوڑنا، ڈنٹر پیلنا، برق ہونا، طبیعت لہرانا، غائب غُلّہ ہو جانا، غُل غپاڑا مچانا

۴۔ متن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے خالی جگہ کے لیے مناسب لفظ کا انتخاب کیجیے۔

الف۔ میں اس نئی دنیا کا ---------- تھا۔

(دریافت کنندہ، واسکوڈی گاما، کولمبس)

ب۔ نہ نئی دنیا رہی نہ پرانی دنیا۔ رہے نام -------- کا۔

(اللہ، خدا، رب)

ج۔ مولانا نے اپنی تمام نظمیں بہت ---------- وقت میں کہی ہیں۔

(تھوڑے، زیادہ، مناسب)

د۔ مولانا ظفر علی خاں زبان اور محاورے کے ------------ ہیں۔

(فنکار، استاد، ماہر)

ہ۔ مولانا جب تک دفتر میں رہتے تھے بڑی -------- رہتی تھی۔

(سراسیمگی، چہل پہل، افسردگی)

۵۔ مندرجہ ذیل اقتباسات کی تشریح سیاق و سباق کے حوالے سے کیجیے:

الف۔ اُن دنوں نئی دنیا کا دفتر ------------ رہے نام اللہ کا۔

ب۔ ہم نے اکثر شاعروں کو دیکھا ہے ------ شعر کہتے چلے جاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

سید امتیاز علی تاج

(۱۹۰۰ء۔۱۹۷۰ء)

قُرطُبہ کا قاضی[1]

افراد

قاضی : یحییٰ بن منصور

زبیر : قاضی کا فرزند

حلاوہ : زبیر کی دایہ

عبد اللہ : ایک خانہ زاد

ناظر عدالت کے چار افسر

ہجوم کی آواز

منظر

غرناطہ میں قاضی یحییٰ بن منصور کے مکان کا ایک ایوان جس کے دریچوں میں سے شہر کے چوک پر نظر پڑ سکتی ہے۔

دائیں ہاتھ کی دیوار میں ایک بڑا سا دریچہ، سامنے کی دیوار میں ایک چوڑا مگر نیچا دروازہ، جس کے پیچھے ایک تنگ اور اندھیری گلی ہے۔ گلی کے دوسری طرف ایک چھوٹا دروازہ، جس میں سلاخیں لگی ہیں۔ بائیں ہاتھ پتھروں کا بنا ہوا زینہ، اوپر کے کمرے کے دروازے تک پہنچا ہے۔ اوپر کے کمرے کی کھڑکی ایوان میں کھلتی ہے۔

ایوان میں ایک بڑی میز ہے جس پر ایک شمعدان رکھا ہے۔ میز کے قریب ایک بنچ اور چند کرسیاں پڑی ہیں۔ دیواروں پر اسلحہ اور جانوروں کے سر لگے ہیں۔

صبح کے دھندلکے میں حلاوہ بنچ پر بیٹھی ہے۔ سر گھٹنوں سے لگا رکھا ہے۔ عبد اللہ دروازے میں سے اندر آتا ہے۔

عبد اللہ: (بھاری آواز میں) شمعیں گل کر دوں؟

حلاوہ: (آہِ سرد کے ساتھ) کر دے، شمعیں صبح کے آنے کو روک نہیں سکتیں۔

(عبد اللہ پھونکیں مار کر شمع دان کی تین شمعیں گل کرتا ہے۔)

حلاوہ: کیسی کالی صبح! میرے رب! کیسی کالی صبح!

---

[1] ''قرطبہ کا قاضی'' انگریز ڈراما نویس لارنس ہاؤس مین کی ایک ایکٹ کی بہت کامیاب ٹریجڈی ہے جس کی ہر ہر سطر میں قوت اور الم موجود ہے۔ امتیاز علی تاج نے اس ڈرامے کو اس خوبی سے سرزمینِ اندلس کا واقعہ بنا دیا ہے کہ گمان بھی نہیں گزرتا کہ یہ انگریزی کے ایک ڈرامے سے اخذ و ترجمہ ہے۔

عبداللہ: کالی اندھوں کے لیے، ان بدفالوں کے لیے جو گھٹنوں پر سر رکھے نحس کلمے منہ سے نکالتے ہیں، پر ربّ العالمین کے فضل و کرم سے ابھی آنکھوں والے بھی موجود ہیں۔ تیری طرح سب اندھے نہیں ہو گئے۔

حلاوہ: (اس کی پروا نہیں کرتی) یہ صبح دیکھنے کو میں زندہ کیوں رہ گئی ...... اور میرے رب! آج کا دن تمام ہونے پر میرا لال کیا ہوگا؟

عبداللہ: زندہ ہوگا اور کیا ہوگا؟ عمر پائے گا اور ربّ العالمین کے فضل و کرم سے تجھے اور مجھے، ہم دونوں کو قبر کے شگاف میں اتارے گا۔

(تکان کی ایک آہ کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے)

حلاوہ: اس کے جسم میں خون جو اپنا تھا اور پروردگار! آج سولی پر اس کی لاش لٹکتی رہ جائے گی۔

عبداللہ: (بے قابو ہو کر) نشترِ زبان! یہ ہرگز نہ ہوگا۔

(گھٹنے سے سر اٹھا کر آہ بھرتی ہے) اب چارہ کیا رہ گیا؟

عبداللہ: سارے قرطبہ میں ایک شخص نہیں جو کسی کے حکم سے بھی اسے سولی پر چڑھائے۔ خواہ اس کے اپنے باپ کا فتویٰ ہو۔

حلاوہ: باپ قاضی ہے۔

عبداللہ: کہا جو کہ اس کے فتوے پر عمل نہ ہوگا۔

حلاوہ: باہر سے لوگ بلا لیے جائیں گے جو اسے ویسے نہیں جانتے جس طرح ہم سب جانتے ہیں۔ انھیں قانون جو کہے گا وہ کر ڈالیں گے۔

عبداللہ: (چڑ کر) میں بک جو رہا ہوں، نہیں کریں گے، آج کے دن صرف شہر میں وہی شخص داخل ہونے پائے گا، جو کلام پاک کی قسم کھائے گا کہ اسے نوجوان زبیر کی سزا سے کچھ سروکار نہ ہوگا۔ سمجھی، گوڑھ مغز! ہمارے آدمی تمام راستوں پر پھیل چکے، ایک ایک ناکے کو روک چکے۔ جس شخص نے قسم نہ کھائی کہ زبیر کا خون اس کے دوش پر نہ ہوگا، وہ اندر نہ گھسنے پائے گا اور یہی جواب قاضی کے حکم پر خود اس کو دیا جائے گا۔ وہ قانون کا غلام ہو یا سلطان کا۔ آج کے دن اس کے فتوے کی تعمیل نہ ہونے پائے گی۔

حلاوہ: لیکن احمق! ہونی کو کون روک سکتا ہے؟ میری یہی آنکھیں نہیں جنھیں آنسوؤں نے بے نور کر دیا۔ میری اور آنکھیں ہیں جو دیکھ سکتی ہیں اور جو دیکھ چکی ہیں۔ سولی اور اس سے لٹکتی ہوئی لاش! میرا ننھا! میری جان ننھا! میرا سجیلا نوجوان! جس کا جسم میرے دودھ نے بنایا، جس کے خون اور ہڈیوں میں میرا دودھ ہے۔ میں اسے مردہ

دیکھ چکی، کہتی جو ہوں کہ یونہی ہوگا۔ سچ نہ ہوتا تو یہ بات میری زبان سے نکلتی؟

عبداللہ: لیکن اسے سولی کی سزا ملے کیوں؟ اس کا جرم کیا ہے؟

حلاوہ: میرے بتانے کی ضرورت ہے کہ اس نے خون کیا ہے؟

عبداللہ: ہاں! مگر محبت کی خاطر! اپنی غیرت کی خاطر! اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ کون کہتا ہے یہ خون ناجائز تھا؟

حلاوہ: نہیں نہیں، اس نے خون جلن کے مارے کیا ہے۔

عبداللہ: محبت جلن نہیں تو پھر ہے کیا؟

حلاوہ: مقتول نے اسے آزار نہ پہنچایا تھا۔

عبداللہ: مقتول کو اس کی محبوبہ سے محبت جو تھی۔

حلاوہ: خوب صورت عورت سے کس کو محبت نہیں ہوتی؟

عبداللہ: لیکن محبوبہ نے مقتول کو محبت بھرا خط بھی تو لکھا تھا۔

حلاوہ: محبوبہ کو اس کا حق تھا۔ وہ زبیر کی منگیتر نہ تھی۔ جسے چاہتی پسند کرنے کا حق رکھتی تھی۔

عبداللہ: صرف اپنوں میں سے، اپنے ہم نسبوں میں سے۔ مقتول پرایا تھا اور دوسرے ملک کا باشندہ تھا۔

حلاوہ: زبیر کے باپ قاضی کا مہمان تھا۔

عبداللہ: اور شرافت کا یہ کون سا طور تھا کہ گھر کے نوجوان کی محبت میں کود پڑے؟ اگر وہ نہ آتا اور اپنی چکنی چپڑی باتوں سے ورغلا نہ لیتا تو زبیر اپنی محبت میں کامیاب نہ ہوتا؟

حلاوہ: شاید اللہ بہتر جانتا ہے۔ پر لڑکی نے اس وقت تک ہاں نہ کی تھی۔

عبداللہ: اس بات کا تو زبیر کو خدشہ تھا کہ کہیں وہ اس کے رقیب کا کام برابر کی لڑائی میں تمام نہ کر دے۔

حلاوہ: زبیر نے یہ کہا نہیں۔ ایک بار بھی نہیں کہا۔ وہ یہ کہتا تو اس کا باپ باور کر لیتا۔ پر ان باتوں سے کیا؟ ارے جتی! اب ان باتوں سے کیا؟ اس نے خون کیا ہے اور خون کی سزا میں اسے دار پر لٹکایا جائے گا۔

عبداللہ: (چڑ کر) اور اسے دار پر لٹکانے تُو جائے گی!

حلاوہ: (ششدر ہو کر) میں؟

عبداللہ: تو نہ ہو تو اس بھرے شہر میں اور کوئی نہیں جو اپنے ہاتھ اس کے خون سے آلودہ کرے۔ (اٹھ کر دریچے کی طرف جاتا ہے) باہر دیکھ، اس ہجوم کو دیکھ! جس نے چوک میں سولی کو گھیر رکھا ہے (حلاوہ اٹھ کر کھڑکی کی طرف جاتی

ہے) یہ سب کس کس کے منتظر ہیں؟

حلاوہ: (جیسے سب کچھ جانتی ہے) بتا تو کس بات کے؟

عبداللہ: سمجھتی ہے یہ سولی کا تماشا دیکھنے کو کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ اس لیے کھڑے ہیں کہ یہ ناپاک کام نہ خود کریں گے اور نہ ہونے دیں گے۔ (ایک سیڑھی چڑھ کر کھڑکی کے پٹ کھول دیتا ہے) لوگو سنو! تم میں سے کون ہے جو قاضی یحییٰ کے لیے اس کے بیٹے کو سولی پر لٹکا دے؟

(ہجوم میں سے ناراضی کی مخلوط آوازیں سنائی دیتی ہیں)

کیوں؟ بولا کوئی شخص؟ کہا کسی نے کہ وہ زبیر کو سولی پر لٹکا سکتا ہے؟ کہا جو، کہ سارے قرطبہ میں ایک شخص کا ہاتھ نہیں جو اسے آزار پہنچانے کے لیے اٹھ سکے۔

(قاضی یحییٰ بن منصور اوپر کی منزل کی کھڑکی کے سامنے سے گزرتا ہوا رکتا ہے۔ ذرا دیر بے حس و حرکت یوں کھڑا رہتا ہے گویا کچھ نہیں دیکھ سکتا ہے)

چپ کیوں ہوگئی؟ بول اب بول نا! کون زندہ شخص ہے جو ان جان نثاروں کی آنکھوں کے سامنے سلطان کے حکم کی تعمیل کی جرأت کر سکے؟

(قاضی کھڑکی سے دروازے کی طرف بڑھتا ہے اور دروازہ کھولتا ہے)

حلاوہ: چپ! دیکھ قاضی! قاضی! وہ سیڑھیاں اتر رہا ہے۔ وہ ادھر ہی آرہا ہے۔

عبداللہ: (آہستہ سے) آنے دے۔

حلاوہ: لاش کی طرح۔

عبداللہ: چپ۔

حلاوہ: آنکھوں میں سے زندگی بجھی ہوئی۔

عبداللہ: چپ۔

حلاوہ: جیسے تنہائی میں موت سے کھیلتا رہا ہے۔

عبداللہ: بک مت۔

حلاوہ: جیسے روح لاش کو چھوڑ کر آرہی ہو۔

عبداللہ: عورت! گونگی ہو جا!

(قاضی سیڑھیاں اتر کر کمرے میں آجاتا ہے اور کچھ دیر خاموش کھڑا رہتا ہے)

قاضی: (بھاری آواز میں) موت کا ڈھنڈورا کیوں نہیں پٹ رہا؟ (حلاوہ کے منہ سے سسکی نکل جاتی ہے، عبد اللہ چپ ہے) میں نے کیا کہا؟ جواب دو۔

عبد اللہ: حضور ڈھنڈورا پیٹنے والا نہیں۔

قاضی: کہاں گئے؟

عبد اللہ: حضور مجھے علم نہیں۔ یہاں نہیں ہیں۔

قاضی: وہ کہاں ہے؟ وہ شخص جسے مجرم کو پھانسی دینا ہے؟

عبد اللہ: حضور کہیں گیا ہوا ہے۔

قاضی: کہیں؟ تُو نے کیا کہا کہیں؟

عبد اللہ: حضور!

قاضی: معنی کیا، کہیں؟

عبد اللہ: چلا گیا تھا۔ اندھیرے منہ ہی، کہہ کر نہیں گیا کہاں جا رہا ہے۔ یہاں نہیں ہے۔

قاضی: ادھر باہر کون ہے...... اور کون ہے؟

عبد اللہ: حضور ایسا کوئی بھی نہیں جو آپ کے فتوے کی تعمیل کر سکے۔ ویسے میرے سوا قرطبہ کے سارے مرد گھر کے باہر کھڑے ہیں۔

قاضی: (جلدی سے جیسے یقین نہیں آتا) قرطبہ کے سارے مرد تیرے سوا؟ یہ معنی کہ تعمیل کے لیے تو آمادہ ہے؟

عبد اللہ: نہیں حضور! میں تعمیل نہیں کر سکتا، نہ کوئی اور شخص جسے میں جانتا ہوں، کر سکتا ہے۔ اگر حضور کو اس فتوے کی تعمیل کرانی ہے تو ابلیس ہی اس کی تعمیل کر سکتا ہے یا آپ خود۔

(قاضی نے پوری بات نہیں سنی لیکن حلاوہ نے سن لی ہے، اس کے منہ سے خوف کی دبی ہوئی آواز نکل جاتی ہے)

قاضی: کیا؟ کیا کہا تھا تُو نے؟

عبد اللہ: (مرعوب ہو جاتا ہے) معاف کیجیے گا حضور! میں صرف اپنے متعلق کہہ رہا تھا۔ رب العالمین میرا مددگار رہو۔ میں جو بات حق سمجھتا ہوں کہہ رہا تھا۔

(خاموشی، نہ کوئی حرکت کرتا نہ بولتا ہے، باہر کے ہجوم میں سے ہلکے ہلکے بولنے کی مدھم آواز آ رہی ہے)

قاضی: ناظر عدالت کے آدمی کہاں ہیں؟

ebooks.pk Freebooks.pk

عبداللہ: نچلی منزل میں حضور!

قاضی: انھیں یہاں بلالاؤ۔

(عبداللہ جاتا ہے۔ قاضی اضطرار میں دو قدم چل کر رک جاتا ہے، حلاوہ سہمی ہوئی کھڑی، بے حد ہمت سے کام لے کر بولتی ہے)

حلاوہ: میں حضور سے پوچھ سکتی ہوں؟

قاضی: کیا ہے عورت؟

حلاوہ: میری بوڑھی زبان سے اللہ تعالیٰ کا عفو و رحم کئی بار بولا لیکن ہر بار اس نے سننے والے کانوں کو بہرہ پایا۔ پر اب کی بار میری التجا سن لیجیے یا مجھے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیجیے۔ میرے حضور! یہ وہ بدنصیب بول رہی ہے جس نے مجرم کی ماں کے اٹھ جانے کے بعد اپنی اولاد کی طرح اسے کلیجے سے لگایا۔ میرے حضور! خود آپ نے اسے مجھے دے ڈالا تھا۔ میں تھی جس نے اسے زندگی دی اور توانائی بخشی کہ وہ بڑھ کر مرد بن جائے۔ میرے حضور! کیا آپ ہی مجھ سے وہ زندگی چھین لیں گے؟ اسے، جسے تب میں نے زندگی بخشی تھی۔ اب وہ جوان ہے۔ آپ کا گوشت اور خون ہے۔ اسے زندہ نہیں رہنا تھا تو یہ سب میں نے کیا کیوں تھا؟ فریاد سننے والا باپ ہے، تو پروردگار! اولاد کے لیے التجا میں کیوں کر رہی ہوں؟ وہ آپ کا ہے۔ میرا نہیں۔ اسے آپ نے پیدا کیا، میں نے نہیں۔ ایک اور عورت اسے جننے میں اس جہاں سے گزر گئی تھی۔

قاضی: بس اور کچھ نہیں۔ تجھے جو کچھ کہنا تھا تو کہ چکی۔ میں بہرا نہیں۔ (حلاوہ پھر بولنا چاہتی ہے)
یہاں سے چلی جا عورت! مجھے اکیلا چھوڑ دے۔ چلی جا!

حلاوہ: بہت اچھا حضور! بہت اچھا!

(سسکیاں روکتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ عبداللہ داخل ہوتا ہے)

عبداللہ: حضور! ناظر عدالت کے آدمی آ گئے۔

قاضی: کیا؟ ہاں آ گئے؟ یہاں بلالاؤ۔

(ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ناظر عدالت کے چار آدمی داخل ہوتے ہیں۔ پل بھر خاموشی) تم لوگ سلطان کے نمک خوار ہو اور اطاعت سلطان کا حلف اٹھا چکے ہو! یہی صورت میری ہے۔ آج ایک شخص کو سولی دی جانی تھی...... سولی دینے والا موجود نہیں۔ تم میں سے کون؟ سنتے ہو میں کیا کہ رہا ہوں؟ اس کی جگہ تم میں سے کون لے سکتا ہے؟ (کوئی جواب نہیں ملتا) کوئی شخص آمادہ نہ ہوا تو مجھے خود کسی ایک کو حکم دینا پڑے گا...... ہوں! کوئی

نہیں؟ ...... دیکھو...... فرض ہم سب کو پکار رہا ہے، قانون کی اطاعت لازمی ہے۔ میں سمجھا تم میں سے کوئی ہامی نہ بھرے گا۔ بہت اچھا قرعہ اندازی سے کام لیا جائے گا۔

افسر: نہیں حضور والا! معاف کیجیے گا ان میں سے کوئی بھی قرعہ اندازی نہیں چاہتا۔ ایک بھی نہیں۔ میں سب کی طرف سے بول رہا ہوں۔

قاضی: میں تم سب کو حکم دیتا ہوں۔

افسر: حضور! اللہ تعالیٰ مجھے توفیق بخشے کہ آپ کے فرزند کو سولی پر چڑھانے سے پہلے میں خود سولی پر چڑھ جاؤں۔

قاضی: تمھیں اس بات کا خیال نہیں کرنا چاہیے کہ مجرم میرا فرزند ہے...... یہ سمجھنا ہے کہ ایک شخص نے خون کیا ہے اور اس کی سزا میں اسے سولی ملنی لازمی ہے۔

افسر: حضور! جس شخص نے اسے مجرم قرار دیا اور اس کے قتل کا فتویٰ لکھا، یہ کام وہ خود کر سکتا ہے، تو کرے، ہم زبیر کو قصوروار نہیں سمجھتے۔

(قاضی کرسی ہٹا کر اُٹھتا ہے اور آہستہ آہستہ دریچے کے قریب جاتا ہے اور اس کے پٹ کھول دیتا ہے۔ پٹ کھولنے پر ہجوم کی آوازوں کی بھنبھناہٹ سنائی دیتی ہے، جو قاضی کا چہرہ دیکھتے ہی بند ہو جاتی ہے)

قاضی: (بلند آواز سے) لوگو! ایک مجرم منتظر ہے کہ اسے سولی دی جائے اور سولی دینے والا کوئی نہیں۔ تم میں سے کوئی ہے جو یہ خدمت سرانجام دے سکے؟ (خاموشی۔ پھر استہزا کی ایسی زیرِلب آوازیں جن سے ظاہر ہے کہ ہجوم کے لوگ قانون کی شکست سے مسرور ہیں)

عبداللہ: کوئی نہیں۔ ایک بھی نہیں؟ ایک بھی نہیں؟

قاضی: (کھڑکی بند کر دیتا ہے اور ذرا دیر چپ رہتا ہے پھر بے اختیاری کی کیفیت میں اس کی آہ نکل جاتی ہے) ناظر! جاؤ قیدی کو باہر لے جاؤ۔ کنجیاں یہ ہیں۔

(کنجیاں نکال کر میز پر پھینک دیتا ہے)

افسر: (کنجیاں اٹھا کر) باہر کہاں حضور؟

قاضی: سولی کے چبوترے پر۔ اور کہاں ...... جلد...... وقت ضائع نہ ہو۔

(سپاہی جاتے ہیں)

(آہستہ سے)

عبداللہ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کرے اور اس کی روح کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

ebooks.pk Freebooks.pk

عبداللہ: (ہیبت زدہ ہو کر منہ ہی منہ میں) ربّ العالمین! ربّ العظیم! اسے سولی دینے کو مل گیا؟...... اسے سولی دینے کو کوئی مل گیا؟

(عبداللہ باہر جاتا ہے۔ افسر سلاخوں والا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتا ہے۔ باقی ساتھی باہر ٹھہرے رہتے ہیں۔ گلی اندھیری ہے۔ سلاخوں والے دروازے کے اندر اور زیادہ اندھیرا ہے۔ اس اندھیرے میں صرف اتنا معلوم ہو پاتا ہے کہ قیدی باہر آیا۔ افسر اس کے پیچھے گلی میں آتا ہے۔ قاضی اس طرف پیٹھ کیے ساتھ کھڑا ہے۔ قیدی سر پھیر کر اسے دیکھتا ہے۔ ناظر عدالت کے آدمی اس کے آگے اور پیچھے کھڑے ہو جاتے ہیں اور گلی کے راستے باہر لے جاتے ہیں...... رفتہ رفتہ ان کے قدموں کی آواز غائب ہو جاتی ہے۔

قاضی اب تک بت بنا کھڑا ہے۔ کوسِ رحلت بجنا شروع ہوتا ہے۔ اس کی آواز سن کر قاضی میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ وہ مڑتا ہے اور آہستہ آہستہ باہر چلا جاتا ہے۔

باہر قیدی کو دیکھ کر ہجوم سے تاسّف کی آوازیں آتی ہیں۔ قاضی کے نمودار ہونے پر خوف و دہشت کی چیخیں سی سنائی دیتی ہیں۔ پھر سناٹا چھا جاتا ہے۔ کوسِ رحلت بجتا رہتا ہے۔

ادھر ایوان میں حلاوہ گھبرائی ہوئی آتی ہے اور دریچے میں سے باہر جھانکتی ہے۔

حلاوہ: لے گئے...... لے گئے۔

(کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگتی ہے۔ باہر کے ہجوم کا شور غُل سنائی دیتا ہے۔)

وہ آیا۔ وہ اسے لے آئے۔ میرا بچہ، میری آنکھ کا تارا، ارے دیکھو تو کیسے تن کر چل رہا ہے۔ اس کا باہر نکلا ہوا سینہ دیکھو! سانس کس بے خوفی سے آ جا رہا ہے! شاباش میرے لاڈلے شاباش! سر اٹھائے رکھ۔ تم پر ہم سب کو ناز ہے۔ تجھ پر میرے دلارے تجھ پر، جسے مر جانا ہے۔ دیکھ لو اسے دیکھ لو۔ جس کے بدن میں گرم خون لہریں مارتا تھا پر جس کے دل میں قاتل کے لہو کی ایک بوند بھی نہیں۔ ہائے پر قاتل موجود ہے۔ آستین چڑھائے کھڑا ہے۔ الٰہی! آج کا آفتاب یہ کیا دیکھ رہا ہے؟ آج کی روشنی میں یہ کیا ہو رہا ہے؟ ربّ العالمین! تو خود اپنی آنکھیں بند کر لے۔ مت دیکھ۔ بیٹے کو باپ کے ہاتھ سولی دینے کو ہیں۔ تیری دنیا میں کبھی یوں بھی ہوا تھا؟ ارے دیکھو تو! ارے دیکھو تو! میرا بچہ ہاتھ چوم رہا ہے، میرا بچہ ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا رہا ہے۔ اس شخص کے جو اسے سولی پر چڑھانے کو ہے۔ جلدی ارے جلدی میرے ربّ! اس کی روح کو جھٹ اپنے دامنِ رحمت میں لے لینا۔ اسے تڑپانا مت! اسے جلدی لے لے۔ اسے جلدی لے لے۔ ہا ...... میرے بچے اپنا دم دے۔ اس کے لیے اور نہ تڑپ۔ مر جا۔ میری جان مر جا! مر جا!!

(کوس رحلت تھم جاتا ہے ہجوم میں سے گریہ و بکا کا ایک دلدوز شور اٹھتا ہے اور بتدریج گھٹ جاتا ہے)

(حلاوہ گھٹنوں کے بل گر پڑتی ہے۔ چہرہ اونچا اور آنکھیں بند کیے، منہ ہی منہ میں دعائیں مانگ رہی ہے۔ عبداللہ آتا اور اسے دیکھتا ہے اور یوں بولتا ہے گویا اس سے غرض نہیں کہ وہ سنے گی بھی یا نہیں)

عبداللہ: اب بھی دعا مانگ سکتی ہے۔ ربّ العالمین! اگر میں دعا مانگ سکتا اور میری دعا قبول ہوسکتی تو ایک موت اور ہوتی۔

(اس کے آخری الفاظ حلاوہ سن پاتی ہے۔ دعا بند کر کے آنکھیں کھولتی ہے اور اس کی طرف مڑتی ہے۔ اس وقت گلی میں قاضی کے بھاری اور آہستہ قدموں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ حلاوہ کھڑی ہوجاتی ہے اور بے حس وحرکت مگر متوقع انداز میں کھڑی رہتی ہے۔ عبداللہ کو بھی قدموں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ مڑ کر دیکھتا ہے اور ایک طرف ہٹ جاتا ہے۔)

عبداللہ: وہ آرہا ہے۔ عورت دیکھ! قاتل آرہا ہے اور اس کی روح پر کالی رات چھائی ہوئی ہے۔

(قاضی داخل ہوتا ہے۔ لڑکھڑا رہا ہے، مگر انتہائی قوتِ ارادی سے کام لے کر سنبھلنا چاہتا ہے۔ گلی میں سلاخوں والے دروازے کو دیکھ کر رک جاتا ہے۔ کھوئی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا ہے اور پھر ضعف کو سنبھالتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ ایوان میں آتا ہے، مڑتا ہے اور سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہے۔ اوپر کے دروازے تک پہنچتا ہے۔ اندر داخل ہوتا ہے۔ اندر سے زنجیر کھلنے اور تالے میں کنجی گھومنے کی آواز آتی ہے۔ ذرا سی دیر میں اوپر کی منزل کی کھڑکی میں سے اس کا ہاتھ نکلتا ہے اور کھڑکی کو بند کر کے اندر سے مقفل کر لیتا ہے)

حلاوہ: اس نے دروازہ بند کر لیا۔ اس نے اپنے آپ کو بند کر لیا۔ یہ دروازہ اب کبھی نہ کھلے گا۔ ہم اب اسے کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ کبھی زندہ نہ دیکھ سکیں گے۔

(قرطبہ کا قاضی اور دوسرے یک بابی کھیل)

سوالات

ا۔ مختصر جواب دیجیے:

الف۔ حلاوہ (زبیر کی دایہ) کو زبیر کے ساتھ اس قدر لگاؤ کیوں تھا؟

ب۔ عبداللہ (خانہ زاد) نے زبیر کو پھانسی کے پھندے سے بچاؤ کے لیے کیا کیا جتن کیے؟

ج۔ زبیر نے کیا جرم کیا تھا جس کی پاداش میں اسے پھانسی کی سزا ملی؟

د۔ زبیر کو پھانسی دینے کی خدمت کے لیے قُرطبہ کا کوئی فرد بھی کیوں مُیسّر نہیں آرہا تھا؟

ہ۔ بالآخر زبیر کو پھانسی دینے کی خدمت کس نے سرانجام دی؟

و۔ پھانسی کی سزا پر عمل درآمد کے بعد قاضی (یحییٰ بن منصور) نے اپنے کمرے کا دروازہ کیوں مقفل کر لیا؟

۲۔ درج ذیل محاورات کا مفہوم واضح کیجیے:

کام تمام کرنا، دن تمام ہونا، خون دوش پر ہونا، ہاتھ خون سے آلودہ کرنا، موت سے کھیلنا، بت بنا کھڑا ہونا، سناٹا چھا جانا، آستین چڑھانا۔

۳۔ درج ذیل حروف کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

ورنہ، چاہے، خواہ، جبکہ، اگر، مگر، کیونکہ، اگرچہ، لیکن، چونکہ، اس لیے کہ

۴۔ اس ڈرامے کے سب سے اہم کردار کا تجزیہ کیجیے۔

۵۔ سبق کے متن کو پیشِ نظر رکھ کر خالی جگہیں پُر کیجیے۔

الف۔ سارے ------- میں ایک شخص نہیں جو کسی کے حکم سے بھی اسے سولی چڑھائے۔

(ملک، شہر، قرطبہ)

ب۔ انھیں ------ جو کہے گا، وہ کر ڈالیں گے۔

(حاکم، قاضی، قانون)

ج۔ آج کے دن اس کے ------ کی تعمیل نہ ہونے پائے گی۔

(فرمان، فتوے، کہے)

د۔ ہجوم میں سے -------- کا ایک دلدوز شور اٹھتا ہے۔

(دیوانہ وار ہنسی، گریہ وبُکا، چیخوں)

ہ۔ الٰہی! آج کا -------- یہ کیا دیکھ رہا ہے۔

(آفتاب، آسمان، زمانہ)

۶۔ اس ڈرامے کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

☆☆☆☆☆

Freebooks.pk

ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن

(ولادت: ۱۹۳۶ء)

مواصلات کے جدید ذرائع

مواصلات شروع سے انسان کی ایک ضرورت رہی ہے۔ پہلے اس کام کے لیے خط دے کر قاصد بھیجے جاتے تھے، پھر گھڑ سوار دوڑائے جانے لگے۔ گھڑ سواروں کے ذریعے بہت دور دور تک پیغامات بھیجے جاتے تھے۔ دور دراز تک پیغامات بھیجنے کے لیے دس دس، بارہ بارہ میل پر منزلیں بنی ہوتی تھیں، جہاں تازہ دم گھوڑے موجود ہوا کرتے تھے۔ گھڑ سوار خطوط کا تھیلا لے کر اگلی منزل کو جاتے اور اسے وہاں کے گھڑ سوار کے حوالے کر کے واپس لوٹ آتے۔ اگلی منزل کا گھڑ سوار بھی ایسا ہی کرتا۔ اس طریقے سے سیکڑوں میل دوری تک خط پہنچائے جاتے۔ مسلمان حکمرانوں نے اپنے زمانے میں گھڑ سواری کے ذریعے مواصلات کے نظام کو بہت ترقی دی تھی۔ اس کے لیے ایک جداگانہ محکمہ قائم کر دیا تھا جو ”دیوان البرید“ کہلاتا تھا۔

بہت زمانے تک مواصلات یا پیغام رسانی کا کام کبوتروں سے بھی لیا گیا۔ خط اس کی گردن میں یا اس کے بازو میں باندھ دیا جاتا اور وہ اسے منزلِ مقصود پر پہنچا دیتا۔ ان کے ذریعے سیکڑوں سال تک پیغام رسانی ہوئی۔ انھیں پہلی بار کس نے استعمال کیا، اس کا تو علم نہیں مگر یہ بات تاریخ کی کتابوں میں بہ کثرت موجود ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے انھیں پورے بلادِ اسلامیہ میں استعمال کیا ہے۔ شام، عراق، مصر اور ایران وغیرہ میں۔ ہندوستان کے مغل فرماں روا جہانگیر نے بھی اس کام کے لیے کبوتر پال رکھے تھے۔ بعد میں یورپ کے حکمرانوں نے بھی پیغام رسانی کے لیے انھیں استعمال کیا۔

جب سائنس کا دور شروع ہوا تو دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ مواصلات میں بھی بڑی ترقی ہوئی۔ گذشتہ صدی میں موٹر اور ریل ایجاد ہو گئی۔ اس کے بعد ڈاک بھی اس کے ذریعے بھیجی جانے لگی۔ انھی برسوں میں ایک ایسا آلہ ایجاد ہو گیا جس نے موٹر اور ریل کی محتاجی ختم کر دی کیونکہ اس آلے کے ذریعے دور دور تک پیغام رسانی کی جانے لگی۔ وہ آلہ ٹیلی گرافی[1] کہلاتا تھا۔ جسے ۱۸۳۸ء میں فنلے مورس نے ایجاد کیا۔ پھر ۱۸۹۵ء میں وائرلیس ایجاد ہو گیا جو کسی تار کو واسطہ بنائے بغیر، فضا میں پائی جانے والی ریڈیائی لہروں[2] کے ذریعے پیغامات پہنچانے لگا۔ ان آلات کے ذریعے پیغام رسانی کے لیے وقت کا عامل بھی ختم ہو گیا کیونکہ یہ جن لہروں پر بھیجی جاتی ہیں، ان کے سفر کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل (تین لاکھ کلومیٹر) فی سیکنڈ ہے جبکہ زمین کا قطر اس سے بہت کم صرف چند ہزار میل ہے۔

۱۔ Telegraphy ۲۔ Radio Waves

Freebooks.pk

وائرلیس کی ایجاد کا اصول یہ ہے کہ سورج سے نکلنے والی تین قسم کی لہروں میں سے ایک قسم برقی مقناطیسی لہریں[1] ہیں جو ریڈیائی لہریں بھی کہلاتی ہیں جبکہ بقیہ دو لہریں روشنی اور حرارت ہیں۔ ان لہروں کو سمجھنے کے لیے آپ پانی کی سطح پر اٹھتی رہنے والی لہروں کو تصور میں لائیں۔ تالاب میں ڈھیلا پھینکتے ہی اس کے پانی میں خلل پیدا ہو جاتا ہے، جس سے اس کے چاروں طرف پے در پے لہریں اٹھنے لگتی ہیں اور وہ یکے بعد دیگرے تالاب کے کناروں کی طرف پھیلنے لگتی ہیں۔ فضا میں بھی پانی کی لہروں کی طرح کی ریڈیائی لہریں ہوتی ہیں۔ خاموش فضا میں کسی بھی قسم کی آواز، ان لہروں میں تالاب کے پانی کی طرح کا خلل پیدا کر دیتی ہے۔ اس خلل کے رونما ہوتے ہی ریڈیائی لہریں اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں، خواہ وہ جگہ بہت دور ہو۔

وائرلیس جو اس اصول پر کام کرتا ہے، اس کے ذریعے پیغام صرف بھیجا نہیں جاتا بلکہ وصول بھی کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے ذریعے پیغامات کا تبادلہ کرنے کے لیے وائرلیس کے دو سیٹوں کا ہونا ضروری ہے۔ ان میں ایک سیٹ فرض کیجیے کہ کراچی میں ہے اور دوسرا حیدرآباد میں، دونوں سیٹوں کی بناوٹ بالکل ایک جیسی ہوگی اور دونوں ایک اصول پر کام کریں گے۔ دونوں سیٹوں میں ایک ایک مائیکروفون ہوتا ہے۔ وہ بجلی کے تار سے منسلک ہوتا ہے جو بیٹری سے بھی کام کر لیتا ہے۔ تار اپنے دوسرے سرے پر ایک ٹرانسمٹر سے منسلک ہوتا ہے۔ ٹرانسمٹر کے دوسرے سرے پر ایریل[2] کا تار منسلک ہوتا ہے۔ کوئی پیغام دوسرے وائرلیس سیٹ پر بھیجنے کے لیے اپنے وائرلیس سیٹ کو منہ کے قریب لاکر پیغام کے جو الفاظ منہ سے ادا کیے جاتے ہیں وہ سب سے پہلے اس کے مائیکروفون[3] میں داخل ہوتے ہیں۔ مائیکروفون سے وہ ارتعاش میں تبدیل ہو کے اندرونی تار کے ذریعے وائرلیس کے ٹرانسمٹر میں پہنچتے ہیں۔ وہاں سے وہ باہر نکل کر ریڈیائی لہروں کی صورت میں ہوا میں چاروں طرف پھیل جاتے ہیں۔ حیدرآباد میں رکھے ہوئے اسی بناوٹ کے وائرلیس سیٹ میں جو ریسیور ہوتا ہے، وہ اس آواز کو ریڈیائی لہروں کی صورت میں وصول کرتا ہے۔ وائرلیس سیٹ کے اندر جو ایمپلی فائر[4] ہوتا ہے، ان لہروں کو طاقتور بنا دیتا ہے۔ پھر وہ لہریں وائرلیس سیٹ کے لاؤڈ اسپیکر میں پہنچتی ہیں جو اسے سننے کے لائق بنا دیتا ہے۔

مارکونی نے وائرلیس بنانے میں پہلی کامیابی ۱۸۹۵ء میں حاصل کی۔ مگر اس وقت تک اس کے ذریعے الفاظ نہیں بلکہ صرف "کھٹ کھٹ کھڑ کھڑ" کی آواز بھیجنے میں کامیابی حاصل کی اور وہ بھی صرف چند گز کی دوری تک۔ پھر اس نے ٹرانسمٹر میں ایریل کا تار لگایا تو آواز بہت دور تک جانے لگی۔ ایریل کی مدد سے اسی سال اس نے ڈیڑھ سو میل تک آواز پہنچا دی۔

وائرلیس کو سب سے پہلے بحری جہازوں کے درمیان پیغام رسانی کے لیے استعمال کیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۸۹۷ء کا ہے، پھر اسے زیادہ عام استعمال کی خاطر ٹیلی گرام بھیجنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ اس کی خاطر جگہ جگہ تار گھر قائم کیے گئے۔

---

1. Electromagnetic waves 2. Arial 3. Microphone 4. Amplifier

27 مارچ 1899 اٹلی اور فرانس

پہلا تار ۲۷ / مارچ ۱۸۹۹ء کو اٹلی سے فرانس بھیجا گیا۔

پھر وائرلیس ٹیلی گرافی کے آلات کو اور ترقی دی گئی تو یورپ سے بحرِ اوقیانوس کے اس پار امریکہ تک تار بھیجے جانے لگے۔ اوقیانوس کے اس پار پہلا پیغام ۲۷ / نومبر ۱۹۰۱ء کو بھیجا گیا۔

تین سال بعد ۱۹۰۴ء میں ایک انگریز سائنس دان ڈاکٹر فلیمنگ نے وائرلیس کے لیے ایک والو[1] ایجاد کیا۔ اس میں خوبی یہ تھی کہ یہ وائرلیس سیٹ میں داخل ہونے والی ریڈیائی لہروں کو جو بہت خفیف ہوتی ہیں، طاقتور بنا دیتا ہے، لہٰذا وہ لہریں لاؤڈ اسپیکر میں پہنچ کے پہلے کے مقابلے میں زیادہ صاف سنائی دینے لگیں۔ والو کا آگے چل کر یہ فائدہ ہوا کہ محض ''کھٹ کھٹ کھڑ کھڑ'' کی آوازوں کے علاوہ انسان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ یعنی گفتگو بھی سنائی دینے لگی۔ یہی کامیابی ریڈیو کی ایجاد کا پیش خیمہ بنی۔ جب تک صرف ''کھٹ کھٹ، کھڑ کھڑ'' وغیرہ کی آواز سنائی دیتی رہی، اس وقت تک وائرلیس سیٹ کو صرف بحری جہازوں کے درمیان اشاراتی پیغام رسانی کے لیے یا ٹیلی گرافی وغیرہ کے لیے استعمال کیا جاتا رہا۔ یہ ایجاد عام آدمی کے کام کی چیز نہ تھی کیونکہ اس میں انگریزی حرف A سے لے کر Z تک جدا جدا قسم کی ''کھٹ کھٹ کھڑ کھڑ ٹک ٹک'' کے اشارات مقرر کرائے گئے تھے اور بس سمندر میں خطرے میں گھرا ہوا جہاز دوسرے جہاز کو مدد کے لیے بلانے کی خاطر وائرلیس پر فرض کیجیے کہ لفظ ''HELP'' کا پیغام بھیجنا چاہتا تو وہ اس لفظ کے چاروں حروف کے لیے مخصوص کیے ہوئے جدا جدا ''کھٹ کھٹ، کھڑ کھڑ، ٹک ٹک'' جیسی آوازوں کے اشارے اپنے وائرلیس سے ارسال کرتا ہے۔ وہ اشارے دوسرے جہاز کے وائرلیس پر بعینہٖ موصول ہو جاتے ہیں۔ وصول کرنے والا جہاز ان اشارات سے اخذ ہونے والے حروف کو اس ترتیب سے یکجا کر کے پڑھ لیتا کہ ''HELP'' مانگی گئی ہے۔

ریڈیو ایجاد تو بلاشبہ مارکونی نے ہی کیا مگر ریڈیائی لہروں کو دریافت کرنے والا کوئی اور تھا اس کا نام ہرٹز تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہرٹز نے جن ریڈیائی لہروں کو دریافت کیا، ان کے وجود کی پیشین گوئی ایک انگریز ماہر طبیعیات میکس وِل نے محض اپنے نظریے کے زور پر کر دی تھی اور ان فوائد کی بھی پیشین گوئی کر دی تھی جو اس کی دریافت کے بعد اس سے حاصل ہوئے۔ مختصر یہ کہ مارکونی کی ایجاد میکس وِل کے نظریے اور ہرٹز کی دریافت کی مرہون منت ہے۔

ریڈیائی مواصلات کو مارکونی کے علاوہ دوسرے بہت سے لوگوں نے بھی ترقی دی۔ اِن میں سے ایک ترقی تو والو کی ایجاد تھی جو ڈاکٹر فلیمنگ کے ہاتھوں ہوئی۔ پھر والو سے بھی بہتر چیز ایجاد ہوئی جو ٹرانسسٹر[2] کہلاتی ہے۔ اسے جون ۱۹۴۸ء میں دو امریکی سائنسدانوں بارڈین اور برٹین نے ایجاد کیا۔

یہ ہے وائرلیس اور ریڈیو کی ایجاد کی مختصر داستان۔ آگے بڑھنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ آپ جدید ریڈیو کے کام کرنے کے اصول کو مختصراً سمجھ لیں تاکہ ٹیلی وژن کی کارکردگی بھی آپ آسانی سے سمجھ سکیں۔

---

1. Valve
2. Transister

Freebooks.pk

ریڈیو اسٹیشن میں پروگرام کرنے والے کی آواز سب سے پہلے مائیکروفون میں داخل ہوتی ہے جو اس کے منہ کے آگے ہی رکھا ہوتا ہے۔ مائیکروفون کے اندر ڈایافرام[1] یعنی ایک پردہ ہوتا ہے جو کان کے پردے کی طرح حساس ہوتا ہے۔ آواز ڈایافرام سے ٹکرا کر اس میں اسی قسم کا ارتعاش پیدا کرتی ہے جیسا کہ کان کے پردے میں ہوتا ہے۔ ڈایافرام کا ارتعاش مائیکروفون سے لگے ہوئے بجلی کے تاروں میں داخل ہوتا ہے۔ وہاں داخل ہو کے یہ برقی لہروں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بجلی کا تار ایک ایمپلی فائر[2] سے منسلک ہوتا ہے جو ان برقی لہروں کو طاقتور بنا دیتا ہے۔ پھر وہ طاقتور برقی لہریں بجلی ہی کے تار کے ذریعے ٹرانسمٹر میں داخل ہوتی ہیں۔ یہاں ان کو مزید طاقتور بنایا جاتا ہے۔ ٹرانسمٹر سے یہ برقی لہریں ریڈیائی لہریں بن کے ایریل کے تار میں پہنچائی جاتی ہیں۔ ایریل کا تار بہت اونچے اونچے کھمبوں پر تنا ہوتا ہے۔ اس تار کے ذریعے ریڈیائی لہریں فضا میں منتشر کی جاتی ہیں، جہاں سے وہ چاروں طرف دنیا بھر میں پھیل جاتی ہیں۔ یہ لہریں صوتی اشارے (ساؤنڈ سگنلز[3]) بھی کہلاتی ہیں۔ راستے میں جہاں جہاں ریڈیو ہوتے ہیں، وہ ان صوتی اشاروں کو پکڑ لیتے ہیں۔ انھیں پکڑنے کے لیے ریڈیو کے اندر رسیور ہوتا ہے۔

صوتی اشارے ریڈیو کے والو میں داخل ہو کے آواز بن جاتے ہیں۔ یہ آواز اس وقت اتنی کمزور ہوتی ہے کہ صاف سنائی دینے کے لائق نہیں ہوتی۔ لہٰذا ریڈیو کے اندر ہی ایک لاؤڈ اسپیکر نصب ہوتا ہے۔ والو سے نکلنے والی آواز لاؤڈ اسپیکر میں داخل ہوتی ہے۔ اس کے اندر بھی مائیکروفون کی طرح کا ڈایافرام ہوتا ہے، جس میں آواز کی لہروں سے ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور آواز صاف سنائی دینے لگتی ہے۔ جدید ریڈیو میں والو کی جگہ ٹرانسسٹر ہوتا ہے کیونکہ اس کی کارکردگی والو سے بہت بہتر ہوتی ہے۔

ریڈیو کی ایجاد سے طرح طرح کے جو فائدے حاصل ہوئے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ طیارے اپنی منزل مقصود پر پہنچنے کے لیے ریڈیائی لہروں سے رہبری حاصل کرتے ہیں۔ طیارے کی منزل جس سمت میں ہوتی ہے، اس سمت میں وہ پرواز کے دوران میں ریڈیائی لہریں پیدا کرنے لگتا ہے۔ اس سے ہوائی جہاز کی آخری منزل تک ایک ''ہوائی سڑک'' بن جاتی ہے۔ جو اپنی منزل (ایئرپورٹ) تک پہنچنے میں اس کے لیے رہبر کا کام دیتی ہے۔ ہوائی اڈوں پر لگے ہوئے راڈار بھی ریڈیائی لہروں کی مدد سے آنے اور جانے والے جہازوں کا علم حاصل کرتے ہیں۔

مواصلات کے لیے ریڈیو سے بھی زیادہ کارآمد ایجاد ٹیلی وژن ہے۔ اسے جان بیرڈ نامی ایک انگریز نے ایجاد کیا۔ ٹیلی وژن بالکل ریڈیو کے اصول پر کام کرتا ہے۔ اس میں بھی آواز کی لہریں صوتی اشاروں کی صورت میں ریڈیائی لہروں کے ذریعے فضا میں بکھیری جاتی ہیں۔ اس میں ایک اضافہ یہ ہے کہ آواز کے ساتھ تصویر بھی ارسال کی جاتی ہے۔ تصویریں صوتی اشاروں کی طرح اشاروں کی شکل میں تبدیل کر کے فضا میں بکھیری جاتی ہیں۔ جو بصری

---

۱ Diaphragm ۲ Amplifier ۳ Sound Signals

اشارے (ویڈیو سگنلز[1]) کہلاتی ہیں۔ راستے میں جہاں جہاں ٹیلی وژن سیٹ ہوتے ہیں وہ صوتی اشاروں کے ساتھ ساتھ بصری اشاروں کو بھی وصول کر لیتے ہیں پھر انھیں روشنی کی لہروں میں تبدیل کرنے کے بعد تصویر کی لہروں میں تبدیل کر کے ٹیلی وژن کی اسکرین پر دکھاتے ہیں۔

اس پورے کام کے لیے ٹیلی وژن کے علاوہ کیمرے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ٹیلی وژن دیکھنے والے کے گھر میں ہوتا ہے جبکہ ٹیلی وژن کیمرہ ٹیلی وژن اسٹیشن میں ہوتا ہے۔ ٹیلی وژن کیمرے میں فلم کی ریل یا ٹیپ نہیں ہوتا کیونکہ وہ فلم بنانے یا ٹیپ کرنے کا کام نہیں کرتا بلکہ تصویروں کو برقی لہروں میں تبدیل کرنے کا کام کرتا ہے۔ برقی لہروں کو بجلی کے تاروں کے ذریعے ٹیلی وژن اسٹیشن سے باہر پہنچا کر ایریل کے ذریعے فضا میں بصری اشاروں کی صورت میں بکھیر دیتا ہے۔ جہاں جہاں ٹیلی وژن ہوتا ہے، وہ اپنے ریسیور کے ذریعے ان بصری اشاروں کو وصول کرتا ہے، ان کو طاقتور بناتا ہے، پھر ان اشاروں کو روشنی کی لہروں میں بدل دیتا ہے۔ روشنی کی لہریں تصویروں کی شکل میں تبدیل کی جاتی ہیں۔ ادھر صوتی اشارے ٹیلی وژن کے ریسیور میں ریڈیو کے اصول پر پہنچتے ہیں' پھر بیک وقت تصویریں سکرین پر اور آوازیں ٹیلی وژن کے لاؤڈ سپیکر کے ذریعے دکھائی اور سنائی دیتی ہیں۔

ٹیلی فون، ریڈیو اور ٹیلی وژن سے بھی زیادہ پرانی ایجاد ہے۔ یہ بھی مواصلات کا نہایت اہم ذریعہ ہے۔ اسے ریڈیو اور ٹیلی وژن پر دو باتوں میں سبقت حاصل ہے۔ اس کے ذریعے دوطرفہ پیغام رسانی ہوتی ہے اور وہ نجی ضرورتوں میں بھی کام آتا ہے۔ گذشتہ برسوں میں اسے کئی طریقوں پر بہتر بنایا گیا۔ پہلے یہ آپریٹر کا محتاج تھا مگر اب اس میں ڈائل لگا کے اسے خودکار بنا دیا گیا ہے۔ ڈائریکٹ ڈائیلنگ[2] کر کے اب دوسرے شہروں، دوسرے ملکوں اور دوسرے براعظموں سے بھی گفتگو کی جانے لگی ہے۔ دوسرے ملکوں اور براعظموں سے زیادہ آسانی کے ساتھ ٹیلی فونی رابطہ قائم کرنے کے لیے گذشتہ برسوں میں مائیکرو ویو لنکس[3] اور مصنوعی سیارے کام میں لائے گئے ہیں۔ ٹیلی فون سیٹ کے ساتھ کارڈلیس[4] سیٹ کا اضافہ بھی ٹیلی فون کی سہولت میں ایک اہم اضافہ ہے۔

۱۹۸۴ء میں موبائل ٹیلی فون ایجاد ہوگیا جسے کار فون بھی کہا جاتا ہے۔ اس سے کار میں سفر کے دوران بھی نمبر ملا کے بات کی جاسکتی ہے۔ اسے کارڈلیس کی ترقی یافتہ شکل کہنا چاہیے کیونکہ یہ بھی ٹیلی فون اور وائرلیس کا امتزاج ہے۔

ٹیلی فون میں مزید تبدیلیاں لانے پر کام ہو رہا ہے۔ موجودہ کوششیں دو اصولوں پر مبنی ہیں: ایک یہ کہ پیغام رسانی کے لیے تانبے کی تاروں کی بجائے بصری ریشے[5] استعمال کیے جائیں اور دوسرا یہ کہ پیغامات کو برقی لہروں میں تبدیل کرنے کے بجائے لیزر کی شعاعوں میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ایک ریشہ کئی کئی ہزار ٹیلی فون تاروں کا بدل ہوگا۔ اس وقت دو شہروں کے درمیان ایک تار پر ایک وقت میں صرف دو آدمی گفتگو کر سکتے ہیں۔ بصری ریشوں اور لیزر شعاعوں[6] کے ذریعے ایک تار (بصری ریشے) پر جدا جدا نمبروں سے ایک وقت میں کئی ہزار آدمی گفتگو کر سکیں گے۔ اس

---

۱. Video Signals	۲. Direct Dialing	۳. Microwave Links
۴. Cordless Set	۵. Optic Fibres	۶. Laser Rays

سے وقت کی بہت بچت ہوگی۔ بصری ریشہ جو ۱۹۶۰ء کی ایجاد ہے، بال کی طرح باریک ریشہ ہے مگر بہت مضبوط ہوتا ہے۔

کمپیوٹر جو بظاہر حساب کتاب کی مشین ہے، ایک مواصلاتی مشین بھی ہے کیونکہ اس کے ذریعے حساب کتاب یا کسی اور قسم کی معلومات پل بھر میں دور سے دور تک پہنچائی جاسکتی ہیں۔ اپنی میکانیت کے لحاظ سے یہ مشین وائرلیس آلات کی توسیع ہے کیونکہ اس میں بھی پیغامات کو برقی لہروں کی شکل میں تبدیل کر کے بھیجا جاتا ہے۔ فرق اس بات میں ہے کہ اس کے ذریعے پیغامات آواز کی شکل میں نہیں بلکہ تحریر کی شکل میں بھیجے جاتے ہیں۔

کمپیوٹر کے کام کرنے کا اصول یہ ہے کہ کمپیوٹر سے پوچھا جانے والا سوال، جواب حاصل کرنے کی خاطر کمپیوٹر کے ایک حصے اِن پُٹ[1] (مَدخَل) میں ٹائپ کرنے کے طریقے پر تحریری شکل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اِن پُٹ میں داخل ہونے کے بعد وہ سوال بجلی کی لہروں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لہروں کی صورت میں یہ کمپیوٹر کے پروسیسنگ[2] یونٹ میں پہنچتا ہے۔ یہ وہاں سوراخ دار مقناطیسی فیتے کے ذریعے پہنچتا ہے۔ پروسیسنگ یونٹ میں کئی حصے ہوتے ہیں جن میں سے ایک اس کی میموری[3] ہے۔ سوال سب سے پہلے وہاں پہنچتا ہے۔ میموری اسے پروسیسنگ یونٹ کے حسابی یونٹ میں بھیجتا ہے۔ وہاں اس کا جواب تیار ہوتا ہے اور پھر وہ کمپیوٹر کے آؤٹ پُٹ[4] (مخرج) پر نمودار ہوتا ہے۔ آؤٹ پٹ سے اسے مقناطیسی فیتے پر یا مشین کے سکرین پر یا کاغذ کے ورق پر حاصل کیا جاسکتا ہے۔

ٹیلی فیکس[5] جسے مختصراً فیکس کہا جاتا ہے، مواصلات کا وہ نظام ہے جو کسی بھیجنے والے کے خط کی فوٹو کاپی تیار کر کے چند منٹوں میں پانے والے کے ہاتھ میں پہنچا دیتا ہے۔ اس مشین کو ٹیلی پرنٹر یا ٹیلی گرام پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ یہ بھیجنے والے کے خط کو اس کی اپنی تحریر میں جوں کا توں پہنچاتی ہے جبکہ ٹیلی گرام اور ٹیلی پرنٹر بھیجنے والے کی تحریر کو اپنی ٹیلی پرنٹر مشین کے ٹائپ رائٹر ٹائپ کر کے پہنچاتے ہیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر خط پانے والا خط بھیجنے والے کی تحریر کو پہچانتا ہے تو خط دیکھ کر وہ حتمی رائے قائم کر سکتا ہے کہ یہ خط اصلی ہے یا جعلی۔

ٹیلی فیکس کی مشین جسامت میں فوٹو کاپی کی مشین کے برابر ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے پیغام رسانی کے لیے دو مشینیں ہونی چاہییں، ایک بھیجنے والے کے پاس اور دوسری پانے والے کے پاس۔ بھیجنے والا جس خط کو بھیجنا چاہتا ہے اسے وہ فیکس کی مشین میں داخل کر کے پانے والے کی مشین کا نمبر ملاتا ہے۔ پھر وہ خط آہستہ آہستہ مشین کے اندر داخل ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کے حروف پہلے روشنی کی لہروں میں تبدیل ہوتے ہیں پھر روشنی کی لہریں بجلی کی لہروں میں تبدیل ہو کے فضا میں بکھر جاتی ہیں اور ریڈیائی لہروں کے ذریعے اشارات (سگنلز) کی شکل میں دوسری مشین، تک خواہ وہ ہزاروں کلومیٹر دور رکھی ہو پہنچ جاتی ہیں۔ خط کے حروف کو روشنی کی لہروں میں تبدیل کرنے کے لیے بھیجے جانے والی فیکس مشین کے اندر ایک فلوریسنٹ[6] بلب ہوتا ہے جس سے بہت تیز روشنی نکلتی ہے۔ یہ روشنی جب خط پر پڑتی ہے تو اس کے حروف

---

1. Input 2. Processing Unit 3. Memory 4. Output 5. Telefax 6. Florescent Bulb

منعکس ہو کر اس مشین کے اندر لگے ہوئے لائٹ سنسر[1] پر پڑتے ہیں ۔ لائٹ سنسر ان حروف کو برقی لہروں (برقی اشارات) میں تبدیل کر دیتے ہیں ۔ یہ اشارات وہاں سے ایمپلی فائر میں پہنچتے ہیں جو ان لہروں کو طاقتور بنا کر فضا میں بکھیر دیتا ہے ۔ ادھر وصول کرنے والی فیکس مشین میں بھی ایک ایمپلی فائر اور ایک سنسر ہوتا ہے، جو بجلی کے اشارات کو طاقتور بنا کے اور پھر انھیں روشنی کی لہروں میں تبدیل کر کے اسے کاغذ کے ایک سادہ ورق پر سطر بہ سطر تحریر کی صورت میں بعینہٖ اتارتا چلا جاتا ہے۔ نقل اتارنے والا یہ کاغذ خاص قسم کا ہوتا ہے اور تھرمل پیپر[2] کہلاتا ہے۔ فوٹو کاپی کا ورق آہستہ آہستہ مشین کے باہر آجاتا ہے۔

مواصلات کے مذکورہ بالا جدید ذرائع کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ پہلے زمانے میں بھیجنے والے کا پیغام کبھی صرف تحریر کی صورت میں یا قاصد کی زبانی پہنچا کرتا تھا، مگر جدید زمانے میں اب وہ ان دونوں طریقوں کے علاوہ خود اپنی زبان میں اور اپنی تحریر میں بھی پہنچنے لگا ہے۔ علاوہ ازیں پہلے ان کاموں میں وقت لگتا تھا مگر اب وقت بالکل نہیں لگتا۔ مستقبل قریب اس سے بھی بڑی خوشخبری کی بشارت دے رہا ہے کہ اکیسویں صدی کے آتے آتے مواصلات پر پیغام بھیجنے والے کی تصویریں بھی دکھائی دینے لگیں گی۔ وہ اسی وقت کمپیوٹر میں محفوظ بھی کر لی جائیں گی اور ایک تار پر ایک وقت میں دو کے بجائے ہزاروں آدمی پیغام رسانی کر سکیں گے۔ (الحمد اللہ! یہ سب کچھ اب ہو رہا ہے)

---

1. Light Senser 2. Thermal Paper

سوالات

ا۔ مندرجہ ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے:

الف۔ قدیم زمانے میں ایک دوسرے کو خط کیسے بھیجے جاتے تھے؟

ب۔ ابتدائی مسلمان حکمرانوں نے پیغام رسانی کے لیے کون سا جداگانہ محکمہ قائم کیا تھا؟

ج۔ کبوتروں سے پیغام رسانی کا کام کیسے لیا جاتا تھا؟ مسلمان حکمرانوں کو اس ضمن میں کیا سبقت حاصل ہے؟

د۔ ریڈیو کی ایجاد میں مارکونی نے کیا کارنامہ سرانجام دیا؟

ہ۔ وائرلیس کی ایجاد کس اصول کے تحت ہوئی؟

و۔ وائرلیس کا استعمال پہلے پہل کن لوگوں نے کیا؟

ز۔ ریڈیو کی ایجاد سے طیاروں کو کیا فائدہ پہنچا؟

ح۔ ٹیلی وژن کس اصول کے تحت کام کرتا ہے؟

ط۔ ٹیلی وژن کا کیمرہ مووی کیمرے سے کس لحاظ سے مختلف ہوتا ہے؟

ی۔ ٹیلی فون کو ریڈیو اور ٹیلی وژن پر کس لحاظ سے سبقت حاصل ہے؟

ک۔ موبائیل ٹیلی فون کس اصول کے تحت کام کرتا ہے؟

ل۔ کمپیوٹر کس اصول پر کام کرتا ہے؟

م۔ ٹیلی فیکس کسے کہتے ہیں؟ اس کے ذریعے خط بھیجنے کا طریقہ بیان کیجیے۔

۲۔ مندرجہ ذیل میں سے مناسب الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے خالی جگہیں پُر کیجیے:

ایمپلی فائر، جان بیرڈ، بحری جہازوں، دیوان البرید، ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل (تین لاکھ کلومیٹر)،

الف۔ اس کے لیے ایک جداگانہ محکمہ قائم کر دیا تھا جو --------- کہلاتا تھا۔

ب۔ ریڈیائی لہروں کے سفر کی رفتار --------- فی سیکنڈ ہے۔

ج۔ --------- آواز کی لہروں کو طاقتور بنا دیتا ہے۔

د۔ وائرلیس کو سب سے پہلے --------- کے درمیان پیغام رسانی کے لیے استعمال کیا گیا۔

ہ۔ ٹیلی وژن --------- نے ایجاد کیا۔

۳۔ اس سبق میں جن جن سائنس دانوں (موجدوں) کا نام آیا ہے، ان کی ایک فہرست مرتب کیجیے۔

۴۔ درج ذیل جملوں کو رموزِ اوقاف کی علامتوں کا درست استعمال کر کے دوبارہ لکھیے:

الف۔ دن ہو کہ رات سفر ہو کہ حضر خلوت ہو یا جلوت انسان کو چاہیے کہ وہ خدا کو نہ بھولے

ب۔ قائدِ اعظم کا فرمان یقینِ محکم اتحاد اور تنظیم ہمارے لیے آج بھی مشعلِ راہ ہے

ج۔ باپ نے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا بیٹا محنت کرو محنت کا پھل ضرور ملے گا

☆☆☆☆☆

Freebooks.pk

شاہد احمد دہلوی

(۱۹۰۶ء۔۱۹۶۷ء)

مولوی نذیر احمد دہلوی

میں نے مولوی نذیر احمد کو صرف پانچ برس کی عمر میں آخری بار دیکھا۔ اس سے پہلے دیکھا تو ضرور ہو گا مگر مجھے بالکل یاد نہیں۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ ہم تین بھائی ابا[1] کے ساتھ حیدر آباد دکن سے دلّی آئے تھے تو کھاری باؤلی کے مکان میں گئے تھے۔ ڈیوڑھی کے آگے صحن میں سے گزر کر پیش دالان میں گئے۔ یہاں دو تین آدمی بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ پچھلے دالان کے دروں میں کواڑوں کی جوڑیاں چڑھی ہوئی تھیں جن کے اوپر رنگ بہ رنگ شیشوں کے بستے بنے ہوئے تھے۔ یہ تین دروازے تھے، جن میں دو کھلے ہوئے تھے اور ایک دائیں جانب کا بند تھا۔ اس کمرے نما دالان میں ہم ابا کے ساتھ داخل ہوئے تو سامنے پلنگ پر ایک بڑے میاں دکھائی دیے۔ ان کی سفید ڈاڑھی اور کنٹوپ صرف یاد ہے۔ ابا جلدی سے آگے بڑھ کر ان سے لپٹ کر رونے لگے اور ہم حیران کھڑے رہے۔ جب ان کے دل کی بھڑاس نکل گئی تو ہمیں حکم ہوا کہ دادا ابا کو سلام کرو۔ ہم نے سلام کیا، انھوں نے پیار کیا۔ ایک ایک اشرفی سب کو دی اور ہم کمرے کے اندھیرے سے گھبرا کر باہر نکل آئے اور کھیل کود میں لگ گئے، اس کے بعد انھیں پھر دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔

مولوی نذیر احمد کو زمانہ سازی بالکل نہیں آتی تھی۔ سچی بات کہنے میں انھیں باک نہ ہوتا تھا۔ حیدر آباد دکن میں بڑے بڑے عہدوں پر مامور ہوئے مگر خوش کسی کو نہ کر سکے۔ اسی وجہ سے زیادہ عرصے تک وہاں نہ رہ سکے اور پنشن لے کر دلّی چلے آئے۔ ان کے لیے ''غیورِ جنگ'' کا خطاب تجویز ہوا تھا، مگر انھوں نے قبول نہیں کیا۔ نواب افتخار علی خاں والی ریاست جاورہ کے بھائی نواب سرفراز علی خاں مرحوم بہت بیمار تھے۔ ان کے لیے طبیبوں کی کیا کمی تھی؟ دنیا بھر کے علاج کرائے مگر شفا نہ ہوئی۔ ایک دن انھوں نے مولوی نذیر احمد کو خواب میں دیکھا کہ ان سے کہہ رہے ہیں: ''ہمارے قرآن کا ترجمہ چھپوا لو، اچھے ہو جاؤ گے۔'' نواب صاحب نے میرے والد کو دلّی خط لکھا اور اس خواب کی روداد بیان کر کے ترجمہ شائع کرنے کی اجازت مانگی۔ والد صاحب نے اجازت دے دی اور صرف ترجمۂ قرآن دو بڑی خوبصورت جلدوں میں ریاست جاورہ کے چھاپہ خانے سے شائع ہوا۔ خدا کی شان کہ نواب صاحب بالکل تندرست ہو گئے اور جب اس واقعے کے کوئی بیس سال بعد میں ان سے ملا تو ستر ے بہترے ہو چکے تھے۔

مولوی احمد حسن صاحب احسن التفاسیر، مولوی نذیر احمد کے خویش تھے۔ ایک دن مولوی نذیر احمد کے ہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ مولوی احمد حسن نے دیکھا کہ ڈپٹی صاحب کی کہنیاں بہت میلی ہو رہی ہیں اور ان پر میل کی ایک تہ چڑھی ہوئی

---

[1] مولوی نذیر احمد کے اکلوتے بیٹے بشیر الدین احمد

Freebooks.pk

ہے۔ مولوی صاحب سے نہ رہا گیا، بولے: ''اگر آپ اجازت دیں تو جھانوے سے آپ کی کہنیاں ذرا صاف کر دوں۔'' ڈپٹی صاحب نے اپنی کہنیوں کی طرف دیکھا اور ہنس کر کہنے لگے: ''میاں احمد حسن! یہ میل نہیں ہے۔ میں جب بجنور سے آ کر پنجابی کٹڑے کی مسجد میں طالب علم بنا تھا تو رات رات بھر مسجد کے فرش پر کہنیاں ٹکائے پڑھا کرتا تھا۔ پہلے ان کہنیوں میں زخم پڑے اور پھر گٹے پڑ گئے۔ لو دیکھ لو، اگر تم انھیں صاف کر سکتے ہو تو صاف کر دو۔'' اس کے بعد اپنا وہ زمانہ یاد کر کے آبدیدہ ہو گئے اور مولوی احمد حسن بھی رونے لگے۔

مولوی صاحب بڑے فخر سے اپنے بچپن کے مصائب بیان کرتے تھے۔ جس مسجد میں ٹھہرے تھے اس کا مُلا بڑا بدمزاج اور بے رحم تھا۔ کڑکڑاتے جاڑوں میں ایک ٹاٹ کی صف میں یہ لپٹ جاتے اور ایک میں ان کے بھائی۔ سات آٹھ سال کے بچے کی بساط ہی کیا؟ علی الصباح اگر آنکھ نہ کھلتی تو مسجد کا مُلا ایک لات رسید کرتا اور یہ لڑھکتے چلے جاتے اور صف بھی بچھ جاتی۔ اس زمانے کے طالب علموں کی طرح انھیں بھی محلے کے گھروں سے روٹی مانگ کر لانی پڑتی تھی۔ دن اور گھر بندھے ہوئے تھے۔ انھی گھروں میں سے ایک گھر مولوی عبدالقادر صاحب کا بھی تھا۔ روٹی کے سلسلے میں جب ان کے ہاں آنا جانا ہو گیا تو نذیر احمد سے اوپر کے کام بھی لیے جانے لگے۔ مثلاً بازار سے سودا سُلف لانا، مسالا پیسنا، لڑکی کو بہلانا۔ لڑکی بڑی ضدّن تھی۔ ان کا کوھا توڑتی اور انھیں مارتی پیٹتی رہتی۔ ایک دفعہ مسالا پیستے میں مرچوں کا بھرا ہوا ڈبا چھین کر ان کے ہاتھ کچل ڈالے۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ یہی لڑکی آگے چل کر مولانا کی بیوی بنی۔

مولوی نذیر احمد بڑے غیور آدمی تھے۔ سسرال والے خاصے مَرفَّہ الحَال تھے، مگر انھوں نے اسے گوارا نہ کیا کہ سسرال والوں کے ٹکڑوں پر پڑے رہیں۔ جب ان کی شادی ہوئی تو غالباً پندرہ روپے کے ملازم تھے۔ اسی میں الگ ایک کھنڈلا لے کر رہتے تھے۔ میں نے بڑی بوڑھیوں سے سنا ہے کہ ان کے گھر میں صرف ایک ٹوٹی ہوئی جوتی تھی۔ کبھی بیوی ان لیتروں کو ہلگا لیتیں کبھی میاں۔

دِلی کالج سے فَارِغُ التَّحصِیل ہونے کے بعد انھیں کوئی سرکاری ملازمت نہیں ملی تو سخت برہم ہوئے۔ پرنسپل سے جا کر ایک دن بولے: ''مجھے سرکاری ملازمت اگر نہیں دی گئی تو اُپلوں کی ڈنڈی کھولوں گا اور اس پر دِلی کالج کی سند لگا دوں گا'' مگر اس کی نوبت نہیں آئی اور انھیں ملازمت مل گئی۔

مولوی عنایت اللہ مرحوم فرماتے تھے کہ جب ہم لاہور سے دلی واپس آ رہے تھے تو ایک ہی ڈبے میں سب سوار تھے۔ سر سید احمد خاں نے کسی بات کے سلسلے میں کہا: ''مولوی صاحب! میں اس لائق بھی نہیں ہوں کہ آپ کے جوتے کے تسمے باندھوں۔'' مولوی نذیر احمد کھڑے ہوئے اور تعظیماً تین آداب بجا لائے۔

سر سید احمد خاں عمر میں مولوی نذیر احمد سے بیس بائیس سال بڑے تھے اور عوام کے علاوہ انگریزی حُکام میں بھی بہت معزز تھے۔ مولوی نذیر احمد بھی ان کی بڑی عزت کرتے اور دامے درمے، قدمے سخنے ان کی مدد کرتے۔ ایک دفعہ علی گڑھ کالج میں ایک ہندو محاسب نے لاکھوں روپے کا غبن کیا اور کالج جاری رکھنا محال ہو گیا۔ اس خبر کو سن کر مولوی نذیر احمد دلی سے علی گڑھ پہنچے اور ہر طرح کی ڈھارس بندھائی۔ بولے: ''اگر روپے کی ضرورت ہو تو یہ روپیا اس وقت موجود ہے، لے لو اور بھی دوں گا اور اگر کسی خدمت کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔'' سر سید اس خلوص سے بے حد متاثر ہوئے۔

مولوی نذیر احمد علی گڑھ کے لیے چندہ اگاہنے کے سلسلے میں بہت کارآمد آدمی تھے، اس لیے جہاں تک ممکن ہوتا سر سید انھیں اپنے دوروں میں ساتھ رکھتے اور ان سے تقریریں کراتے۔ نذیر احمد کی قوتِ تقریر کے متعلق کہا جاتا تھا کہ انگلستان کا مشہور مقرر بَرک بھی اُن سے زیادہ موثر تقریر نہیں کر سکتا تھا۔ اب بھی اگلے وقتوں کے لوگ، جنھوں نے مولوی صاحب کے لیکچر سنے ہیں، کہتے ہیں کہ یا تو ہم نے ڈپٹی صاحب کو دیکھا یا اب اخیر میں بہادر یار جنگ مرحوم کو دیکھا کہ سامعین پر جادو سا کر دیتے اور جو کام ان سے چاہتے لے لیتے۔ جب چاہا انھیں ہنسا دیا اور جب چاہا ان کی جیبیں خالی کرا لیں اور عورتوں کے زیور تک اتروا لیا کرتے تھے۔

مولوی نذیر احمد عربی میں غیر معمولی استعداد رکھتے تھے۔ کئی کئی سال سے لوگوں کا ان پر تقاضا تھا کہ قرآن مجید کا ترجمہ کرو مگر وہ پس و پیش کرتے اور کہتے کہ یہ کام ان لوگوں کا ہے جو خدمتِ دین میں اپنی ساری ساری عمر صرف کر چکے ہیں مگر جب پنشن لے کر وہ دلّی آ گئے تو تیئسیر کا ترجمہ شروع کیا اور اس سلسلے میں اکثر آیاتِ قرآنی کا ترجمہ بھی کرنا پڑا۔ اس سے انھیں اندازہ ہوا کہ یہ کام اتنا دشوار نہیں ہے جتنی کہ طبیعت میں ہچکچاہٹ ہے۔ چنانچہ کئی مولویوں اور عالموں کے مشوروں سے انھوں نے قرآنِ مجید کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ ایک ایک لفظ پر ردّ و قدح ہوتی اور بالآخر ایک رائے ہو کر ترجمہ لکھ لیا جاتا۔ ترجمہ مکمل ہونے کے بعد بھی ایک نابینا جید عالم کو پڑھ کر سنایا گیا اور ایک اور عالم کو نظر ثانی کے لیے باہر بھیجا گیا۔ جب کاپیوں کی تصحیح ہوئی اور پروف دیکھے گئے، تب بھی ان میں ترمیم کی گئی اور جب تک اس کی طرف سے پورا پورا اطمینان نہیں ہو گیا، اسے شائع نہیں کیا گیا۔ اس میں ڈھائی سال لگ گئے مگر ترجمہ بھی ایسا شُستہ و رفتہ اور بامحاورہ ہوا کہ اب پچھلے پچاس برس میں کوئی اور ترجمہ اس سے بہتر شائع نہیں ہو سکا۔ خود مولوی صاحب کو اپنی تمام کتابوں میں ''ترجمۃ القرآن'' ہی پسند تھا اور وہ فرماتے تھے کہ میں نے اور سب کتابیں دوسروں کے لیے لکھی ہیں اور یہ ترجمہ اپنے لیے کیا ہے کہ یہی میرا توشۂ آخرت ہے۔

(گنجینۂ گوہر)

سوالات

۱۔ مختصر جواب دیجیے:

الف۔ مصنف نے مولوی نذیر احمد کو پہلے پہل کب اور کن حالات میں دیکھا تھا؟

ب۔ مولوی نذیر احمد کے لیے حیدر آباد دکن میں کیا خطاب تجویز ہوا تھا؟

ج۔ ریاست جاورہ کے نواب کے بھائی معجزاتی طور پر کیسے صحت یاب ہوئے؟

د۔ مولوی نذیر احمد کی کہنیوں پر گٹے کیسے پڑے تھے؟

ہ۔ مولوی نذیر احمد کا بچپن کن حالات میں بسر ہوا؟

و۔ جب ایک ہندو محاسب نے علی گڑھ کالج میں لاکھوں کا غبن کیا تو نذیر احمد نے سرسید سے کیا کہا؟

ز۔ مؤثر تقریر کرنے کے ضمن میں کن دو آدمیوں کا شہرہ تھا؟

ح۔ مولوی نذیر احمد اپنا توشۂ آخرت کسے گردانتے تھے؟

۲۔ درج ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے۔

دل کی بھڑاس نکالنا، لات رسید کرنا، ڈھارس بندھانا، جادو کرنا، پس و پیش کرنا۔

۳۔ درج ذیل الفاظ کا تلفظ اعراب کی مدد سے واضح کیجیے۔

غیور، تاسف، احسن التفاسیر، خویش، فارغ التحصیل

علی الصباح، مقربین، جید عالم، مرفہ الحال، ردوقدح

۴۔ ہم رکاب اور با اثر میں بالترتیب ''ہم اور با'' سابقے ہیں۔ ان سابقوں کی مدد سے بنے ہوئے بے شمار الفاظ اردو میں مستعمل ہیں۔ جیسے ہم درس، ہم دم، ہم دوش، ہم دیوار اور باادب، باخبر، باقاعدہ، باوجود وغیرہ۔ آپ ان دونوں سابقوں سے دس دس الفاظ بنائیے۔

۵۔ سبق کے متن کو پیش نظر رکھتے ہوئے خالی جگہیں قوسین میں دیے ہوئے موزوں لفظ سے پُر کیجیے۔

الف۔ مولوی نذیر احمد کو---------- بالکل نہیں آتی تھی۔ (زمانہ سازی، حیلے بازی، ٹال مٹول)

ب۔ اس کے بعد اپنا وہ زمانہ یاد کر کے--------- ہو گئے۔ (خوش، رنجیدہ، آبدیدہ)

ج۔ مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کے باب میں وہ سرسید احمد خاں کے------ تھے۔ (مخالف، حامی و مددگار، مُربّی و محسن)

د۔ مولوی صاحب کو اپنی تمام کتابوں میں------ ہی پسند تھا۔ (ترجمہ تیسیر، مرآۃ العروس، ترجمۃ القرآن)

☆☆☆☆☆

ابن انشا

(۱۹۲۷ء۔۱۹۷۸ء)

ایک سفرنامہ جو کہیں کا بھی نہیں ہے

ہم نے سفرنامے بہت لکھے ہیں۔ چین و ماچین کے سفر نامے، ایران وتُوران[1] کے سفر نامے، ان جگہوں کے سفرنامے جہاں، ہم نہیں گئے اور ان وارداتوں کا چشم دید احوال جو ہم نے نہیں دیکھیں۔ انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے ٹانگیں بے شک دی ہیں لیکن دماغ بھی تو دیا ہے جس کی اہمیت ٹانگوں کے برابر نہ ہو، بہر حال ہے تو۔

آج کا سفرنامہ ہے تو سفر نامہ لیکن اگر کوئی پوچھے کہ کہاں کا ہے تو بتا بھی نہ سکیں۔ آج صبح ہم کابل کے لیے چلے تھے، لیکن رات ہوگئی ہے اور کابل پہنچے نہیں ہیں۔ پہلے راولپنڈی میں لیٹ ہوئے، پھر پشاور سے چلنے میں تعویق ہوئی۔ آخر چلے۔ پائلٹ نے بتایا کہ آپ کے نیچے اس وقت درہ خیبر ہے۔ پھر کہا، یہ داہنی طرف کو جلال آباد کا قصبہ ہے اور ٹیڑھی میڑھی جوئے کم آب دریائے کابل کہلاتا ہے۔ اب آپ حکومتِ افغانستان کے وہ فارم بھر دیجیے جن میں وطنیت قومیت وغیرہ لکھنی ہوتی ہے اور اب صاحبان! (پائلٹ نے کھنکار کر کہا) اب تھوڑی دیر میں ہم پشاور کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں کیونکہ کابل گھنگور بادلوں میں چھپا ہوا ہے۔ وہاں ہم اتر نہیں سکتے۔ امید ہے آپ کا سفر خوشگوار گزرا ہوگا۔

دراصل آثار شروع ہی سے ٹھیک نہیں تھے۔ جب سے کابل جانے کا سنا لوگ ہمیں برابر ڈرا رہے تھے کہ سردی ہے جانا نہیں، مرجاؤ گے۔ مولانا حامد علی خاں نے کہا، میں کابل میں دو دو اوورکوٹ پہن کر بھی یہ محسوس کرتا تھا کہ تن زیب کا انگرکھا پہنے ہوئے ہوں۔ حمید اختر نے نصیحت کی کہ جاتے ہی وہاں سے دُگلا نما افغانی کوٹ خرید لینا (ورنہ میں نتائج کا ذمہ دار نہ ہوں گا) ان لوگوں کا ہم ذکر نہیں کرتے جو ہم سے جل کر طعنے تشنے پر اُتر آئے تھے۔ ایک نے تو یہاں تک کہا کہ کیا کابل میں گدھے نہیں ہوتے جو تم وہاں جا رہے ہو۔ خیر، فکر ہر کس بقدرِ ہمت اُوست[2]۔

ایک جونا مارکیٹ ہم شرماشرمی میں نہیں گئے، ورنہ کون سی جگہ ہے جہاں سے ہم نے اپنے لیے کپڑے جمع نہیں کیے۔ ہمیں دراصل اوورکوٹ وغیرہ درکار تھے اور کوئی اُونی زیر جامہ مل جاتا تو سبحان اللہ لیکن ہماری شہرت ایسی خراب ہوئی کہ لوگوں نے قیاس کیا، ہم شاید فلسطین کے مہاجروں یا افغانستان کے پاوندوں کے لیے کپڑے جمع کر رہے ہیں۔ نتیجۃً سب نے اپنے پھٹے ہوئے، گھسے ہوئے کپڑے ہمارے سر منڈھنے کی کوشش کی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر واپس دے گا تو

---

[1] وسط ایشیا کا وہ علاقہ جو فریدون کے بیٹے "تور" سے منسوب ہونے کی وجہ سے توران کہلاتا تھا۔

[2] ہر شخص کا خیال اس کے ظرف اور حوصلے کے مطابق ہی ہوتا ہے۔

ڈرائی کلین کرا کے دے گا۔ نہ دے گا تو ہماری جان ان کپڑوں سے چھوٹے گی۔ دونوں صورتوں میں نقصان اسی شخص کا ہے۔ اوورکوٹ ہمارے پاس دو ہو گئے۔ ایک تو آغا جعفری کا عطیہ اتنا خوب صورت اور دیدہ زیب کہ پہننے کو جی نہ چاہے۔ دوسرا حبیب اللہ شہاب کا جو شاید انھوں نے قطب شمالی کی مہم کے لیے بنوایا تھا کیونکہ ہم نے اسے پہنا تو بوجھ کے مارے زمین پر بیٹھ گئے۔ دو آدمیوں نے ہماری بانہوں میں ہاتھ دے کر ہمیں دوبارہ کھڑا کیا اور پھر اسے پہن کر ہم بالکل برفانی ریچھ معلوم ہوتے تھے۔ بس رنگ کا فرق تھا کیونکہ برفانی ریچھ غالباً سفید ہوتا ہے۔ کُلّہ و دستار ہم سر پہ نہیں رکھتے لیکن اس خاص موقعے کے لیے ایک فیلٹ خریدی، اس کا الٹا سیدھا معلوم کیا۔ لومڑی کی کھال کے دستانے لیے، گلے میں کانگڑی ڈالنے کا بھی خیال تھا لیکن وہ کشمیر کی خاص چیز ہے، ہمارے کراچی میں نہیں ملتی۔

اس سارے ساز و سامان سے لیس ہو کر دمِ تحریر ہم پشاور میں پڑے ہیں۔ یہ ڈین ہوٹل کا کمرہ ۴۷ ہے۔ آتش دان میں آگ دہک رہی ہے۔ جس طرح ہمارے گاؤں کے فتح دین درزی نے کراچی میں ایف۔ ڈین اینڈ سنز ٹیلرز اینڈ آؤٹ فٹرز کے نام سے اپنی دکان لگائی اور چمکائی ہے۔ اس سے ہم سمجھتے تھے کہ ڈین ہوٹل بھی کسی احمد دین یا نور دین کا ہوگا لیکن ہوٹل کا ناک نقشہ بتاتا ہے کہ یہ واقعی کسی انگریز بہادر کی ملکیت رہا ہے۔ لان کشادہ، احاطہ کشادہ، کمرے کشادہ، ہر چیز کشادہ ہے سوائے مالکوں کے دل کے، کیونکہ ہمارے کمرے میں بجائے غالیچوں کے ان کی کترنیں پڑی ہیں۔ ٹھنڈے کمرے کے فرش پر ان پر پاؤں رکھتے ہوئے یوں گزرنا پڑتا ہے جیسے کیچڑ میں پڑی ہوئی اینٹوں پر بچتے بچاتے قدم رکھتے ہوئے چلتے ہیں۔ لاؤنج[1] کے قالین بھی گھسے پھٹے ہیں اور عظمتِ رفتہ کی کہانی کہہ رہے ہیں۔ جدید ہوٹلوں کی سی نہ اس میں شان ہے نہ آسائش۔ اپنی عمرِ طبیعی میں سے یہ کچھ ہنس کر گزار چکا ہے اور کچھ رو کر گزار رہا ہے۔ سید محمد جعفری نے جو مصرع پرانے کوٹ کی مدح میں لکھا تھا، ہمیں اس ہوٹل کو دیکھ کر یاد آیا:

ع کسی مرے ہوئے گورے کی یادگار ہے یہ

باوجود فون کرنے کے کوئی دوست پشاور میں نہ مل سکا لیکن پشاور والوں کی عالی حوصلگی سے ہم کماحقہٗ، متاثر ہو چکے ہیں۔ ہمیں پی آئی اے کے دفتر جانا تھا۔ کسی نے بتایا کہ انٹرنیشنل ہوٹل میں ہے۔ ہم نے اپنے ہوٹل کے کاؤنٹر پر جا کر پوچھا کہ کتنی دور ہے یہ جگہ؟ تو کاؤنٹر کلرک نے بتایا کہ جناب بالکل ہمارے پچھواڑے ہے، بس کوئی ایک فرلانگ ہوگی۔ آپ ہوٹل کے دروازے سے نکل کر بڑی سڑک پر آیے اور بائیں ہاتھ کو چلیے بس سامنے ہی ہے۔

جب ہم اس ہدایت کے مطابق کوئی پون میل کی مسافت طے کر چکے تو ایک صاحب سے پوچھا۔ انھوں نے کہا، پی آئی اے کا دفتر! اجی وہ تو یہ رہا۔ آپ کو اسی راستے پر ایک سینما ملے گا، اس کے بعد بس پی آئی اے کا دفتر ہے اور واقعی اس جگہ سے کوئی آدھ میل آگے ہمیں وہ دفتر مل گیا۔ یہ جگہ واقعی ڈین ہوٹل کے پچھواڑے میں ہے لیکن ایسا ہی ہے جیسے کراچی

1۔ LOUNGE (انتظارگاہ)

کے پچھواڑے میں کاٹھیاواڑ ہے اور لاہور کے پچھواڑے میں تبت پڑتا ہے۔ انسان عالی حوصلہ ہو تو اسے میل اور فرسنگ کے فاصلے فرلانگیں اور گز ہی معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارا پشاور کی مزید سیر کرنے کا بھی ارادہ تھا لیکن اس ایک مثال سے خائف ہو گئے کیونکہ ہم ان بزرگ سے پوچھتے کہ درّہ خیبر کتنی دور ہے تو وہ یقیناً یہی فرماتے کہ بس دومنٹ کا راستہ ہے سیدھے اس سڑک پر چلے جایئے۔ اگلے چوک پر داہنے ہاتھ کو درہ خیبر ہی تو ہے۔

پشاور کے ہوائی اڈے پر ہم نے اپنے ہم سفروں میں ایک ادھیڑ عمر کے بزرگ کو دیکھا کہ لمبی سرخ داڑھی ہے اور سر پر بھی کنگھی سے بے نیاز بالوں کا جھاڑ کھڑا ہے۔ تھوڑا لنگڑاتے ہیں اور چھڑی لے کر چلتے ہیں۔ پھول دار واسکٹ پہنے ہوئے تھے یعنی ان کی وضع قطع، سج دھج سب سے الگ تھی۔ ہم پی آئی اے کے کاؤنٹر پر اپنا ٹکٹ دکھارہے تھے کہ وہ مسکراتے ہوئے ہمارے پاس آئے اور فرمایا۔ تمہارے پاس یہ SAS یعنی سکنڈے نیوین ایئر سروس کا ٹکٹ کہاں سے آ گیا؟ ہم نے بتایا کہ یونیسکو[1] جس کی طرف سے ہم نے یہ سفر اختیار کیا ہے، اس نے پیرس سے اس کا انتظام کیا تھا۔ بولے مجھے یوں جستجو ہوئی کہ میں ڈنمارک کا ہوں اور SAS میرے وطن کی کمپنی ہے۔ اس پر بات چل نکلی۔ ہم نے انھیں بتایا کہ آپ کے وطن کی زیارت بھی ہم کر چکے ہیں۔ کوپن ہیگن کے علاوہ السی نور[2] بھی گئے تھے۔ جہاں ہملٹ[3] کا قلعہ ہے اور جہاں سے سمندر پار سویڈن نظر آتا ہے۔

بولے، مجھے افسوس ہے کہ میں نے ساری عمر ڈنمارک میں گزار کر السی نور آج تک نہیں دیکھا۔ ہم نے یہ کہ کر ان کی ڈھارس بندھائی کہ ہم نے بھی کراچی میں آدھی عمر گزار دی ہے لیکن منگھو پیر نہیں گئے۔ زیادہ تفصیل میں ہم نہیں گئے تاکہ ہمارا منگھو پیر ان کے السی نور کے مقابلے میں کچا نہ پڑ جائے۔ یہ ڈاکٹر گلبرگ تھے۔

ڈاکٹر گلبرگ دوا دارو والے ڈاکٹر ہیں لیکن نسخوں کے علاوہ کتابیں بھی لکھتے ہیں اور یہی ہماری ان سے دوستی کی وجہ ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی کتاب ''اسکیمو ڈاکٹر'' برطانیہ اور امریکہ کے علاوہ کئی ملکوں میں چھپ چکی ہے۔ ہم نے ریڈرز ڈائجسٹ میں اس کا ذکر یا خلاصہ پڑھا تھا اور کچھ کچھ یاد تھا۔ یہ سن کر وہ اور خوش ہوا اور اپنی بی بی سے کہا۔ دیکھو یہ شخص کتنا پڑھا لکھا ہے اس نے غیڈ غ ڈائجسٹ میں میری کتاب کا ذکر پڑھا ہے۔ فرانسیسیوں کی طرح ''ر'' کا تلفظ وہ ہمیشہ ''غ'' ہی کرتے رہے۔

ڈاکٹر گلبرگ مہم جو آدمی ہیں۔ برسوں وہ گرین لینڈ جا کر اسکیموؤں کے ساتھ رہے۔ ان کی زبان اور معاشرت اختیار کی۔ انھی کا سا بے نمک کھانا کھاتے رہے۔ یہی مچھلی، ریچھ کا گوشت وغیرہ، برف کے جھونپڑوں میں قیام کیا اور پھر یہ کتاب لکھی۔ اب میاں بی بی ایشیا اور مشرقِ بعید کے دورے پر نکلے تھے۔ کینیا، ہندوستان، تھائی لینڈ اور نیپال ہوتے ہوئے پاکستان آئے تھے۔ اب کابل اور تہران ہو کر وطن واپسی کا پروگرام تھا۔ ہندوستان سے یہ لوگ ایک شب ٹھہر کر

---

1. UNESCO (United Nations Scientific and Cultural Organization)
2. Elsinore Castle
3. Hamlet

بھاگے کیونکہ یہ پارلیمنٹ اسٹریٹ پر ''جن پتھ'' ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اس روز سادھوؤں اور غیر سادھوؤں کی طرف سے گئوکشی کے معاملے پر خوف ناک مظاہرہ ہوا تھا جس میں جان و مال کا بے حد نقصان ہوا۔ مظاہرین نے مغربی ٹورسٹوں کو بھی جہاں وہ نظر آئے گھیر لیا اور کہا یہ لوگ بھی مسلمانوں سے کم نہیں۔ یہ بھی گائے کا گوشت کھاتے ہیں۔ بڑی مشکل سے یہ خشمگیں مجمعے کے نرغے سے نکل کر ہوٹل واپس پہنچے اور اسی دن نیپال روانہ ہو گئے۔

پاکستانیوں خصوصاً پشاور والوں کے یہ بہت معترف تھے کہ بڑے تپاک اور خلوص سے ملتے ہیں۔ پی آئی اے کی خاص طور پر تعریف کرتے تھے کہ اس کے آدمی بہت خلیق اور متواضع ہیں۔ ہاں اپنے پشاور والے ہوٹل کے نام سے بے مزا ہوتے تھے۔ کہتے تھے یہ نظر بٹو ہے تاکہ پاکستان کو نظر نہ لگ جائے۔ دیکھو کابل ہوٹل میں یہ چار ڈالر روزانہ کا کتنا اچھا کمرہ ہے۔ اسے گرم رکھنے کا مرکزی نظام بھی ہے۔ قالین، فرنیچر، سروس سبھی کچھ معقول۔ پشاور میں میں تین روز رہا اور اس باوا آدم کے زمانے کے کمرے کے تیرہ ڈالر روزانہ دیتا رہا۔ یہی نہیں ان لوگوں نے پانچ روپے روزانہ اس لکڑی کے بھی مجھ سے وصول کیے جو کمرہ گرم رکھنے یا اس میں دھواں پھیلانے کے لیے روزانہ جلانی پڑتی تھی۔

جاتے ہوئے جن لوگوں نے ہم سے پوچھا تھا کہ کیا کابل میں گدھے نہیں ہوتے؟ ان کی اطلاع کے لیے گزارش ہے کہ ہوتے ہیں اور بہت ہوتے ہیں۔ یہاں ہمارا مطلب چار ٹانگوں والی بلا سینگ کی مخلوق سے ہے۔ دو ٹانگوں والے بھی یقیناً ہوں گے ہم نے زیادہ جستجو نہیں کی۔ یہ گدھے وہ تھے جو زرنگار پارک کے سامنے قطار در قطار کھڑے تھے اور ان کے پالان سنگتروں سے بھرے تھے۔ یہاں سنگترے تل کر بکتے ہیں۔ ڈاکٹر گلبرگ کی بی بی سنگتروں پر مچل گئیں اور بولیں ان کا بھاؤ پوچھو۔ ہم نے بھاؤ پوچھا: ''آغا چند است؟[1]''

ایران کی طرح یہاں بھی یہ معلوم ہوا کہ فارسی بولنا آسان ہے۔ سمجھنا مشکل۔ آغا نے جو جواب دیا۔ وہ ہمارے پلے نہ پڑا۔ حالانکہ ہم نے چہ؟ چہ؟؟ کر کے ایک دوبارہ وضاحت بھی چاہی۔ ان غیر ملکیوں کو یہ بتانا غیر ضروری تھا کہ یہ گدھے والا ان الفاظ میں ادائے مطلب سے قاصر ہے جو ہماری سمجھ میں آ سکیں۔ لہٰذا ہم نے کہا چھوڑیے۔ بہت مہنگا دیتا ہے لیکن وہ خاتون تھوڑی دور ایک اور گدھے کے پاس مچل گئیں کہ یہاں سے لے لو یہ سستا دے گا۔ ہم نے ایک باٹ کی طرف اشارہ کر کے سنگتروں والے سے کہا کہ آغا بس ایں قدر دے دو۔ اس نے تولا تو چار سنگترے پڑے۔ قیمت ہم نے نہ پوچھی کہ افہام و تفہیم میں دقت نہ ہو۔ آخر باہم زبان سمجھنے نہ سمجھنے کا معاملہ ہمارا اور ہمارے افغان بھائیوں کا ہے ڈنمارک والوں کو اس سے کیا مطلب۔ ہم نے دس افغانی کا نوٹ دیا۔ اس نے چار افغانی کاٹ کر باقی ریزگاری ہمیں دے دی۔ ڈاکٹر گلبرگ اور ان کی بی بی نے ہمارا بہت شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس دیارِ غیر میں جہاں ہماری زبان اور انگریزی سمجھنے والا کوئی نہیں، تم ہمارے ساتھ نہ ہوتے تو ہم کیا کرتے۔ ہم نے موزوں الفاظ میں کسرِ نفسی کے بعد کہا کہ خیر انسان، انسان کے کام آتا ہی ہے۔ بنی آدم اعضائے یک دیگر اند[2] وغیرہ

---

[1] آغا اس کا کیا بھاؤ ہے؟ [2] سب انسان ایک دوسرے کے اعضا ہیں۔

جس کام سے ہم کابل گئے تھے، اس کا تعلق کتابوں سے تھا۔ ہم نے اپنے ایک افغانی دوست سے کہا کہ ہمیں کسی پبلشر سے ملوائیے۔

بولے ''یہاں کوئی پبلشر ہی نہیں''

''چھوٹا موٹا تو ہوگا؟''

''نہ چھوٹا نہ موٹا''

''پھر کتب فروش کتابیں کہاں سے لیتے ہیں؟''

''کتب فروش؟ کون سے کتب فروش؟''

ہم نے کہا ''بازار میں کتابیں بیچنے والوں سے مطلب ہے۔ اس کے علاوہ ریلوے اسٹیشنوں پر بھی بک اسٹال ہوتے ہیں۔ کابل قندھار وغیرہ میں ہوں گے ہی، جہاں سے مسافر سفر میں دل بہلانے کے لیے ناول رسالے، جنتریاں وغیرہ خریدتے ہیں۔''

ہمارے دوست نے کسی قدر جھلاہٹ سے کہا:

''میاں! ہوش کی دوا کرو، کون سے ریلوے اسٹیشن اور کیسی ریلوے؟ تمھیں معلوم ہے افغانستان میں ریلوے نام کی کوئی چیز نہیں یہ شیطانی چرخہ تمھی کو مبارک ہو۔''

تب ہمیں افغانستان کے متعلق وہ مضمون یاد آیا جو ہم نے کابل جانے سے پہلے پڑھا تھا۔ لکھا تھا کہ ''ادھر آپ نے درّہ خیبر کے پار، افغانستان کی نئی سرزمین میں قدم رکھا، ادھر ایک صدی پیچھے پہنچ گئے۔''

پبلشروں کی حد تک تو ٹھیک ہے کہ افغانستان میں اس نام کی کوئی مخلوق نہیں۔ حکومت کے محکمے اور ادارے سرکاری مطبعوں میں کتابیں چھاپتے ہیں۔ ان کی بھی مکمل تعداد پورے ملک میں پانچ ہے۔ پرائیویٹ پریس کوئی نہیں ہے۔ اوّل تو ان حالات میں کوئی شخص کچھ لکھنے کا حوصلہ ہی نہیں کرتا اگر کوئی مرزا غالب یا فیض احمد فیض پیدا ہو بھی جائے تو ازراہِ قانون اسے حکومت کو عرضی دینی چاہیے کہ بندے کی یہ تالیفِ لطیف زیورِ طبع سے آراستہ کی جائے۔ وہ ٹھوک بجا کر (کسی کام میں جلدی نہیں کی جاتی) دیکھیں گے کہ ہاں کوئی مضائقہ نہیں تو حکم ملے گا کہ اچھا چھاپ دیتے ہیں۔ کاغذ، کتابت، طباعت کے پیسے لاؤ اور جب چھپ جائے تو جہاں جی چاہے، جیسے جی چاہے بیچو۔

مانگ کا حال یہ ہے کہ کچھ کتابیں شائقین خرید لے جاتے ہیں، کچھ بنیا لے جاتا ہے اور اس میں کشمش، چلغوزے وغیرہ ڈال کر بیچتا ہے۔ ہمارے انھی دوست نے فرمایا کہ تم جو کچھ بھی کہو۔ اس نظام میں مصلحت یہ ہے کہ لوگ بیہودہ شاعری اور رنگیلے ناولوں وغیرہ سے محفوظ رہتے ہیں۔

ریلوے کی کہانی یہ معلوم ہوئی کہ شاہ امان اللہ خان نے اپنے زمانے میں دارالامان نام کی تازہ بستی بسائی تھی

Freebooks.pk

وہاں تک ریلوے لائن ...... ریلوے لائن نہ کہیے ٹرالی لائن بچھائی تھی۔ بچہ سقہ[1] نے ان کا تاج وتخت چھینا تو پوچھا یہ کیا چیز ہے؟ چنانچہ فرنگیوں کی بدعت قرار دے کر اکھاڑ پھینکا۔ ہم نے ''دارالامان'' میں اس کے اکھڑے ہوئے زنگ خوردہ سلیپر اور دو تین ٹوٹی پھوٹی بوگیاں آثارِ صنادید کے طور پر ایک جھونپڑے کے سامنے کھڑی پائیں جو ایک زمانے میں ریلوے اسٹیشن تھا۔

دریائے کابل جو شہر کے بیچوں بیچ بہتا ہے، ہمارے ہوٹل سے کچھ دور نہ تھا۔ دریا لفظ کے استعمال کے لیے ہم دریائے ستلج اور سندھ، دریائے گنگا اور جمنا، دریائے ہوانگ ہو اور ینگسی وغیرہ سے تہِ دل سے معذرت خواہ ہیں۔ کراچی والے دریائے کابل کی وسعت کا اندازہ کرنا چاہیں تو اس گندے نالے کو دیکھ لیں جو نہ جانے کہاں سے آتا ہے اور کہاں جاتا ہے لیکن ویمن کالج کے پاس سے گزرتا ہے۔ فرق اس نالے اور دریائے کابل میں یہ ہے کہ اس نالے کا پانی نسبتاً صاف ہے اور اس میں اتنی زیادہ بو نہیں آتی۔ پانی کی مقدار بھی آج کل تو اسی نالے میں زیادہ ہے۔ ہاں گرمیوں میں سنا ہے برف پگھلتی ہے تو دریائے کابل کی ناطاقتی کچھ دور ہو جاتی ہے۔ دیوار پر سے نیچے جھانکیں تو دریا کی غریب نوازی کا نقشہ یہ نظر آتا ہے کہ یہاں ایک بڑھیا کپڑے دھو رہی ہے۔ تھوڑا آگے اس میں بچے نہا بھی رہے ہیں اور آس پاس کے گھر والوں کو بھی کوڑا پھینکنے کا بڑا آرام ہے۔ ٹوکری اٹھائی اور دریا میں جھاڑ دی یہی دریا پیاسوں کی تشنگی بھی رفع کرتا ہے کیونکہ نئے حصۂ شہر کو چھوڑ کر پرانے شہر میں گھروں تک پانی کے پائپ لے جانے کا کوئی سلسلہ نہیں۔ ہتھی والے اور کہیں کہیں دوسرے نلکے البتہ ہیں جن سے محلے والے اپنی باری سے مٹی کے مٹکے اور جھجریں بھر لے جاتے ہیں۔ ان مٹکوں کی وضع قطع کے ظرف ہم نے یا تو عجائب گھروں میں دیکھے یا پھر رباعیاتِ عمر خیام کی بعض تصویروں میں صراحی آپ نے دیکھی ہے؟ ان سے ذرا بڑے ہوتے ہیں، لہٰذا انھیں صراحا کہہ لیجیے۔ ایک طرف کو پکڑنے کے لیے دستہ بھی لگا دیجیے۔ بے شک اب حکومت پانی پائپوں کے ذریعے گھروں تک پہنچانے کا بندوبست کر رہی ہے، لیکن فی الحال تو شہر میں سقوں کا راج ہے۔ ایک سقہ تو کچھ دنوں تک ملک کا بادشاہ بھی رہا ہے، لیکن وہ الگ کہانی ہے۔

(دنیا گول ہے)

---

[1] افغانستان کا ایک حکمران جو ماشکی کا بیٹا تھا اور ڈاکو بن گیا تھا اور جس نے شاہ امان اللہ خان سے حکومت چھین لی تھی۔

سوالات

ا۔ مختصر جواب دیجیے:

الف۔ مصنف ابتدا میں کابل کے بجائے پشاور کے ہوائی اڈے پر کیوں اترے؟

ب۔ مصنف نے پشاور کے عرصۂ قیام کے دوران میں کس ہوٹل میں قیام کیا اور یہ ہوٹل ان کو کیسا لگا؟

ج۔ مصنف پشاور کی سیر سے کیوں خائف ہو گئے؟

د۔ ڈاکٹر گلبرگ نے اپنی کتاب ''اسکیمو ڈاکٹر'' لکھنے کے لیے کیا کیا جتن کیے؟

ہ۔ ڈاکٹر گلبرگ اور ان کی بی بی کو بطورِ سیاح ہندوستان میں اپنا عرصۂ قیام کیوں مختصر کرنا پڑا؟

و۔ ڈاکٹر گلبرگ کی بی بی نے کابل میں سنگترے کیسے خریدے؟

ز۔ مصنف نے کابل جانے سے پہلے افغانستان کے بارے میں کیا پڑھا تھا؟

ح۔ افغانستان میں پبلشرز یا بک سیلرز کیوں نہیں ہوتے؟

ط۔ افغانستان میں ریلوے لائن کیوں نہیں ہے؟

۲۔ مصنف نے دریائے کابل کا جو نقشہ کھینچا ہے، اسے اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۳۔ درج ذیل الفاظ کا تلفظ اعراب کی مدد سے واضح کیجیے:

توران، تعویق، کلہ، کماحقہ، کسرنفسی، بدعت، آثارصنادید، خشمگیں

۴۔ درج ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے:

کچا پڑنا، نظر لگنا، مچل جانا، پلے پڑنا، سر منڈھنا، جان چھوٹنا، بے مزا ہونا

۵۔ سبق کے متن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے خالی جگہوں کو پُر کیجیے:

الف۔ ان لوگوں کا ہم ذکر نہیں کرتے جو ہم سے جل کر ------- پر اتر آئے تھے۔ (مار کٹائی، تو تکار، طعنے تشنے)

ب۔ آتش دان میں آتش -------- رہی ہے۔ (جل، دہک، سلگ)

ج۔ ان کی وضع قطع ------- سب سے الگ تھی۔

(سج دھج، شکل صورت، تراش خراش)

د۔ ''افغانستان میں ریلوے نام کی کوئی چیز نہیں، یہ -------- تمھی کو مبارک ہو۔''

(بدعت، ایجاد، شیطانی چرخہ)

ہ۔ پورے ملک میں مطبعوں کی تعداد --- ہے۔

(پانچ، پچاس، اَن گنت)

و۔ شاہ امان اللہ خاں نے اپنے زمانے میں ---------- نام کی تازہ بستی بسائی تھی۔

(دارُالعوام، دارالامان، دارالاسلام)

۶۔ مندرجہ ذیل جملوں کو مطابقت کے اصولوں کے پیشِ نظر درست کر کے لکھیے:

الف۔ ''مکاتیبِ غالب'' چھپ گئے ہیں۔

ب۔ جلسے میں عورتیں بھی آئیں ہوئیں تھیں۔

ج۔ میاں بیوی ہنسی خوشی رہتی ہے۔

د۔ گھر عورت کی سلطنت ہوتی ہے۔

ہ۔ نیکی کا راہ بہت کٹھن ہے۔

☆☆☆☆☆

رشید احمد صدیقی
(۱۸۹۲ء-۱۹۷۷ء)

ایوّب عباسی

ع تمھاری نیکیاں زندہ تمھاری خوبیاں باقی

محمد ایوب عباسی مرحوم کے بارے میں کیا کہوں اور کہاں سے شروع کروں! وہ اتنے اچھے تھے اور اتنے ارزاں تھے اور اتنے ناگزیر تھے کہ اُن کے بارے میں کچھ کہنا شروع کروں تو سب سے پہلے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ نہیں وہ، یہاں سے نہیں وہاں سے، ابھی نہیں آگے چل کر، یوں نہیں وُوں۔

وہ موجود تھے تو اُن کی مثال نعائم فطرت کی تھی مثلاً: ہوا، پانی، روشنی جو اس درجہ عام و ارزاں ہیں کہ ان کی طرف توجہ مائل نہیں ہوتی لیکن اُن میں سے کسی میں کہیں سے کوئی فرق آ جائے تو پھر دیکھیے کیسی کیسی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اور یہی ناقابلِ التفات چیزیں کیسی نعمتیں بن جاتی ہیں۔

ایوب ایسے ہی تھے۔ وہ دوستوں کی زندگی میں اس طرح اور اس درجہ گھل مل گئے کہ ہم سب کو اُن کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہوتا لیکن جب وہ ہم سے رخصت ہو گئے تو ہم میں سے ہر ایک نے یہ محسوس کیا کہ جو چیز ناقابلِ التفات حد تک ارزاں و عام تھی وہی ناقابلِ بیان حد تک اچھی، ضروری اور نایاب تھی۔

ہم سب کی زندگیوں میں مرحوم کے گھل مل جانے کا راز یہ تھا کہ اُن میں بظاہر کوئی بات غیر معمولی نہ تھی۔ وہ غیر معمولی قابلیت کے آدمی نہ تھے، دولت مند نہ تھے، کچھ بہت ذہین بھی نہ تھے۔ نہ انھیں توڑ جوڑ آتا تھا، نہ خوش پوشاک، نہ خوش گفتار، نہ خوش باش، نہ رنگین و رعنا۔ وہ معمولی آدمیوں سے بھی زیادہ معمولی تھے۔ پھر بھی وہ ایسے تھے کہ اب ہم میں ویسا کوئی اور نہ اب ڈھونڈے سے بھی کوئی ایسا ملے۔

سیاہ فام، چیچک رُو، پست قد، نحیف الجثہ۔ پہلے پہل کوئی دیکھے تو منہ پھیر لے، برت لے تو غلام بن جائے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ ایوب کی خوبیوں نے اُن کی بدہئیتی کو کس درجہ دل آویز بنا دیا تھا۔ میری ہی نہیں میرے عزیزوں اور دوستوں کی بھی اُن سے بڑی پرانی ملاقات چلی آتی تھی اور میں نہیں بتا سکتا کہ ہم سب کی زندگی میں ایوب کس قدر دخیل تھے اور اُن کی موت نے ہم سب کو کیسا بے قرار و مایوس اور کس درجہ بے دست و پا کر دیا۔ سب جانتے ہیں کہ اُن کی جدائی کا جو الم مجھے ہے اس سے کم دوسروں کو نہیں ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے، اس پیکرِ حقیر میں دل سوزی و خود سپاری کا کیسا بے کراں و بیش قیمت خزانہ ودیعت تھا۔

مجھ پر، میرے بچوں پر، میرے دوستوں پر اور میرے خاندان پر جان چھڑکتے تھے۔ خوشی کی بات ہو تو ایوب صاحب سب سے پہلے موجود اور سب سے زیادہ خوش۔ رنج و تردّد کا موقع ہو تو سب سے پہلے حاضر۔ بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں، کسی کو خاطر میں نہیں لاتے، یا ہر شخص کی خوشامد کر رہے ہیں۔ خوشی میں ہر طرح کے جملے سرکر رہے ہیں اور اپنی مسرت کا طرح طرح سے اظہار کر رہے ہیں۔ رنج و مایوسی کا موقع ہو تو ایک حرف زبان پر نہیں، نہ تسکین کا، نہ تقویت کا، چپ چاپ بیٹھے سراپا کا جائزہ لے رہے ہیں یا محبت و ہمدردی سے بے اختیار ہو کر منہ تک رہے ہیں۔ ذرا بھی احتمال ہوا کہ کسی کا آنا یا کسی معاملے میں میرا دخل میرے لیے تکلیف دہ ہوگا تو اسے پہلے ہی سے بھانپ کر کسی نہ کسی طرح اس کا سدِ باب کر دینا اور اس طرح کرنا کہ مجھے کانوں کان خبر نہ ہو۔

میرا اور میرے دوستوں کا یہ حال تھا کہ ہاتھ پاؤں ہلانا نہ ہو اور ایوب سب کام کر دے۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی تھیں جن کی تمام تر ذمے داری ہمیں پر ہوتی لیکن اس سے بہ ذاتِ خود عہدہ برآ ہونے کے بجائے یا اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو تو ہم سب ایوب صاحب ہی پر بگڑتے تھے اور بہانے نکال نکال کر انھیں سخت سُست کہتے تھے۔ ایوب صاحب معمولی ململجی شیروانی پہنے، ٹوٹا پھوٹا جوتا، میلا سا مفلر گلے میں لپیٹے جلدی جلدی چلے آ رہے ہیں۔ ہائے اُن کا وہ چھوٹا سا قد، مشکل سے پانچ فٹ، مشغول و منہمک، مفلر جلدی جلدی کھولتے لپیٹتے، راستے میں ہر ایک سے کچھ کہتے سنتے، گرتے پڑتے چلے آ رہے ہیں۔

ایوب صاحب کا گھر بارہ مہینے تھرڈ کلاس کا مسافر خانہ بنا رہتا تھا، ہر طرح کے لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ بالخصوص اعزّہ اور دوستوں کے لڑکے۔ مجھے یقین ہے اور میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ ایوب صاحب کے گھر میں قیام کر کے اُن کے خرچ سے، ان کی توجہ و محنت سے، ان کے بل پر اعزّہ اور احباب کے جتنے لڑکوں نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی ہو گی، اتنا اب تک کسی اور شخص سے نہ اب تک ہوا اور نہ شاید آئندہ ہو۔

اُن کے گھر میں طالب علموں کا وہ ہجوم کہ اندر جا کر دم گھٹنے لگتا تھا۔ ہر شخص کو کھلانا پلانا، سامان دینا، ان کی ضرورتوں کو نظر میں رکھنا اور ان کی فکر کرنا۔ اس کے بعد آفس کا کام، دوستوں کا کام، غرض اس شخص کی مشغولیتیں دیکھ کر ہم سب تعجب کیا کرتے تھے کہ یہ شخص زندہ کیسے ہے اور اس کے حواس کیوں کر بجا ہیں۔

دوستوں میں سے کوئی بیمار پڑا اور یہ آ موجود ہوئے، رات دن کا مسلسل قیام، پاؤں دبا رہے ہیں، سر میں تیل ڈال رہے ہیں، دوا لا رہے ہیں، کھانا تیار کر رہے ہیں۔ بیماری میں آدمی چڑچڑا ہو جاتا ہے چنانچہ اس کی ہر قسم کی زیادتیاں بھی سہ رہے ہیں۔ بیمار اچھا ہوا تو شکریے میں بھی سخت سُست ہی کلمات کہے۔

ایوب صاحب کی سیرت و شخصیت کا عجیب اور نادر پہلو یہ تھا کہ بڑے سے بڑا آدمی ہو یا چھوٹے سے چھوٹا، ان

سے عزت آمیز محبت کرتا تھا۔ ترس کھا کر یا مجبور ہو کر نہیں بلکہ ان سے محبت کرنے میں اسے لطف آتا تھا۔ ایوب سے محبت کر کے جیسے دل کو تسکین ہو جاتی تھی، ایک طرح کی پُر افتخار اور اطمینان بخش تسکین۔ جیسے یہ احساس کہ ہم میں بھلائی کرنے یا بلند ہونے کا جذبہ یا استعداد ہے۔ ایوب سے محبت نہ کیجیے یا اُن کی عزت نہ کیجیے تو یہ محسوس ہوتا کہ ہم میں شریفانہ جذبات یا احساسِ ذمے داری کی کمی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی مدِّ نظر رکھیے کہ ایوب صاحب کے دل میں یہ بات کبھی گزری ہی نہیں کہ ان کی خدمات کا صلہ مل رہا ہے یا نہیں۔ معاوضے کا احساس شاید ان میں پیدا ہی نہیں کیا گیا تھا۔ بڑے چھوٹے کی خدمت یکساں لطف و تن دہی سے کرتے تھے۔

پرووسٹ[1] کے دفتر میں سب سے اہم عہدہ پر ہونے کے سبب ان کا سابقہ اساتذہ، بیرا، باورچی، نائی، چپراسی، بھنگی، بہشتی سب ہی سے براہِ راست پڑتا تھا۔ طلبہ کو خوش اور مطمئن رکھنا معمولی بات نہیں ہے۔ ان کا ایوب صاحب سے طرح طرح سے سابقہ پڑتا تھا۔ وہ ہر طالب علم کے خاندانی حالات و معاملات سے واقف رہتے تھے اور اسی اعتبار سے اُن سے سلوک کرتے تھے۔ اس لیے ہر طالب علم ان کو اپنے گھر کے بزرگ اور خیر اندیش کی حیثیت سے دیکھتا تھا۔ یونیورسٹی میں اسٹرائیک ہے۔ لڑکے ہیں کہ بے قابو ہوئے جاتے ہیں لیکن ایوب صاحب کا جادو برابر کام کر رہا ہے۔ ایسے زمانے میں ان کا طرزِ عمل لڑکوں سے وہی ہوتا جو میدانِ جنگ میں صلیبِ احمر کا ہوتا ہے۔

ایوب صاحب یونیورسٹی کے معاملات یا الجھنوں سے ہمیشہ علیحدہ رہتے اور حتی المقدور اپنے دوستوں کو بھی علیحدہ رکھنا چاہتے تھے۔ اس قسم کے مسائل پر انھوں نے مجھ سے گفتگو نہ کی۔ کبھی فرصت ہوتی اور یقین ہوا کہ میں گھبراؤں گا نہیں تو وہ اپنے خاندانی قضیوں کا تذکرہ چھیڑتے اور جو کچھ دل میں ہوتا، بیان کر دیتے۔ میں ان کی الجھنوں کو ہمدردی اور توجہ سے سنتا تو ایسا محسوس کرتے جیسے ان کا جی ہلکا اور اُن کے دکھ درد کا مداوا ہو گیا۔ وہ اپنے رشتے داروں سے کچھ بہت زیادہ راضی نہ تھے۔ سب کے سب ایوب صاحب کی شرافت اور کشادہ دلی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے درپے رہتے تھے۔ اس کا انھیں غم تھا اور غم غلط ہی کرنے وہ میرے پاس آیا کرتے تھے۔ ایک دن بہت اُداس تھے، آئے تو میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح ان کا جی بہل جائے۔ معلوم نہیں کیا ہوا کہ وہ یک بہ یک آبدیدہ ہو گئے۔ میں نے پوچھا تو بڑے تامّل کے بعد واقعہ سنایا وہی عزیزوں کی دنایت اور شقاوت کا۔ میں نے کہا: ''ایوب صاحب بد دل نہ ہوں، آپ کا کوئی قصور نہیں، قصور ہے تو صرف اتنا کہ آپ خوش حال اور نیک نام کیوں ہیں۔ ہمارے آپ کے اعزّہ کے دلوں سے نیکی اور فیاضی اٹھالی گئی ہے۔ اغیار کو تو یہ مسرور اور بافراغت دیکھ کر خوش ہوں گے اور فخر کریں گے، لیکن اپنوں کو کھاتا پیتا یا ہنستا بولتا دیکھ کر غم و غصہ کے انگاروں پر لوٹنے لگیں گے۔ یہ اپنے نکمّے پن اور بے غیرتی کو اپنی بہت بڑی خوبی اور اپنا حق سمجھتے ہیں۔ یہ اپنے کھاتے کماتے عزیز کو غاصب سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آپ نے اُن نعمتوں پر قبضۂ مخالفانہ کر رکھا ہے جو بہ صورتِ دیگر ان کے قبضہ میں آتیں۔ وہ کبھی نہ دیکھیں گے کہ وہ خود کتنے ناکارہ اور بے اطمینان ہیں اور جو فراغت،

---

[1] پرووسٹ (Provost) ہاسٹلز کا منتظم اعلیٰ

ناموری اور نیک نامی سے رہ رہا ہے، اس نے کتنی محنت کی ہے اور اذیت اٹھائی ہے۔''

مرحوم اپنے جن بزرگوں یا دوستوں کو عزیز رکھتے تھے، انھیں میرے ہاں ضرور لاتے اور مجھ سے ملا کر بہت خوش ہوتے۔ پھر بڑا اصرار کرتے کہ میں اُن سے اُن کے گھر یا جائے قیام پر جا کر مل آؤں۔ یہی نہیں بلکہ جس کسی کو تکلیف یا مصیبت میں دیکھتے یا اس کے ہاں خوشی کی کوئی بات ہوتی تو مجھے خبر کرتے کہ میں وہاں ہو آؤں۔ میں ایسا کر دیتا تو اُن پر مسرّت وشکر گزاری کا عجیب عالم طاری ہوتا۔ ظاہر ہے اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ میری اس بھلمنساہٹ کی لوگ قدر کریں لیکن یہ بات یہیں نہیں ختم ہو جاتی۔ واقعہ یہ ہے کہ جس شخص یا بات سے انھیں تقویت یا مسرّت پہنچتی تھی، اس میں وہ مجھے بھی شریک کر لینا چاہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ میں نے ان کے انتخاب کو پسند کر لیا تو اس پر استناد کی مہر لگ گئی۔ تیسرے یہ کہ انھوں نے جس کو مجھ سے ملایا، اس کے ساتھ بہت بڑا سلوک یہ کیا کہ مجھ ایسے (بہ زعم خود) معقول آدمی سے اسے متعارف کیا۔ بہ ظاہر یہ باتیں دوراز کار اور خود میرے برخود غلط ہونے پر دال ہیں اور اپنے منہ سے اب اُن کا تذکرہ کرنا میرے لیے بڑی بھدی بات ہے لیکن میں مرحوم کی بعض تحت شعوری سے واقف ہوں۔ ان کا مقصد وہی تھا جو میں نے بیان کیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک لطیفہ سنیے: ایک دن بڑے اصرار سے کہنے لگے کہ رشید صاحب پتلون پہنا کیجیے۔ میں نے کہا آخر کیوں۔ کہنے لگے ہرج ہی کیا ہے۔ میں نے بڑے تعجب سے پوچھا، آخر اس فرمائش کی تک کیا ہے۔ کہنے لگے کہ جی چاہنے میں تک کو کیا دخل۔ میرے ان کے ایک بے تکلف دوست بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے یہ ردّ وقدح سنی تو معاملے کی نوعیت دریافت کرنے لگے۔ میں نے بتایا تو اچھل پڑے، کہنے لگے رشید صاحب قیامت تک نہ پہنیے گا۔ اس نے ایک پتلون سلوائی ہے۔ اسے پہننا چاہتا ہے۔ آپ سے ڈرتا ہے۔ اس کی باتوں میں نہ آیئے گا۔ دیکھوں تو کس طرح پہنتا ہے!

سردی کا روز اور دوستوں کا مجمع تھا۔ ہم سب ڈاکٹر عباد الرحمٰن خاں کے ہاں بیٹھے تھے کہ ایوب مرحوم نے کہا: ''سردی لگ رہی ہے'' کسی نے توجہ نہ کی۔ تھوڑی ہی دیر بعد لیکن کسی قدر بے قرار ہو کر کہا! ''بڑی سردی ہے، رشید صاحب میں چلا۔'' ڈاکٹر عباد نے کہا: ''نہ ٹھکانے سے کھاتے ہو، نہ شریفوں کی طرح رہتے ہو، سردی کیوں نہ لگے۔'' یہ کہ کر اندر سے اپنا اوزنی گرم کوٹ لائے اور مرحوم کو اچھی طرح اوڑھا دیا۔ چائے منگائی اور پلائی۔ اس کے بعد بھی مرحوم نے کہا: ''رشید صاحب میں چلا۔'' میں ان کے لہجے سے اور ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر چونکا۔ ہم سب انھیں اوڑھا ڈھکا کر ان کے مکان پر پہنچا آئے۔ صبح سے بخار نے زور پکڑا۔ لاکھ لاکھ جتن کیے گئے لیکن کمزوری بڑھتی ہی گئی۔ دوستوں کی تشویش بڑھی، مایوسی بڑھی اور مرض الموت بڑھا۔ دو تین ہفتے کے اندر سب کچھ ہو گیا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ مرض کیا ہے۔ سب نے یہی فیصلہ کیا کہ وقت آ پہنچا۔

شام کے قریب نزع کے عالم میں تھے۔ مکان کے باہر یونیورسٹی کے طلبہ اور عمائدین کا مجمع تھا، لیکن ان سے قریب اور ان ہی میں ملا ہوا ایک اور ہجوم تھا۔ بھنگی، بھشتی، چپڑاسی، نائی، دھوبی، بیرے، باورچی، خانساماں، خوانچے والے اور ان میں سے بہتوں کے بیوی بچے، خاموش، مایوس، سر جھکائے! اور یہ وہ ہجوم تھا جو کسی مرنے والے کے دروازے پر، جب کہ وہ اس جہان سے گزرنے والا ہو، میں نے گذشتہ پچیس سال میں نہیں دیکھا تھا۔

مرحوم کو سپردِ خاک کیا گیا۔ مولانا ابوبکر صاحب نے قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر فرمایا: ''بھائیو! ایوب اپنے پیدا کرنے والے کے ہاں پہنچ گئے۔ اگر تم میں سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچی ہو تو معاف کر دینا۔'' گریہ سب کے گلوگیر ہوا، کسی نے روکا اور کسی نے نہ روکا! ایک غم نصیب کے قلب کی گہرائیوں سے ایک اور دردناک صدا بلند ہوئی:

''کیا یہاں کوئی ایسا بھی موجود ہے جس پر ایوب کی خدمات کا صلہ واجب الادا نہ ہو؟'' اس آواز کو سنا کسی نے نہیں، محسوس سب نے کیا۔

(گنج ہائے گراں مایہ)

سوالات

۱۔ سبق کے متن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے:

الف۔ ایوب عباسی کے سب کے ساتھ گھل مل جانے کا راز کیا تھا؟

ب۔ ایوب عباسی کی خدمت شعاری کا انداز کیا تھا؟

ج۔ آپ کے خیال میں ایوب عباسی کی سیرت کا سب سے منفرد پہلو کیا تھا؟

د۔ یونیورسٹی کے ملازمین کے ساتھ ایوب عباسی کا سلوک کیسا تھا؟

ہ۔ ایوب عباسی کے انتقال پر لوگوں کے جذبات کا کیا عالم تھا؟

۲۔ مندرجہ ذیل میں سے درست لفظ منتخب کر کے خالی جگہوں کو پُر کیجیے:

واجب الادا، دخیل، صلیبِ احمر، نعائمِ فطرت، دل سوزی و خود سپاری، لطف و تن دہی

الف۔ وہ موجود تھے تو ان کی مثال--------- کی تھی۔

ب۔ میں نہیں بتا سکتا کہ ہم سب کی زندگیوں میں ایوب کس قدر--- تھے۔

ج۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے، اس پیکرِ حقیقی میں------- کا کیسا بے گراں و بیش قیمت خزانہ ودیعت تھا۔

د۔ چھوٹے بڑے کی خدمت یکساں------- سے کرتے تھے۔

ہ۔ ان کا طرزِ عمل لوگوں سے وہی ہوتا جو میدان جنگ میں ------ کا ہوتا ہے۔

و۔ ''کیا یہاں کوئی ایسا بھی موجود ہے جس پر ایوب کی خدمات کا------ نہ ہو۔''

۳۔ مندرجہ ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے:

جُملے سر کرنا، کانوں کان خبر نہ ہونا، عہدہ برآ ہونا، دم گھٹنا، جادو کام کرنا، جی ہلکا ہونا، انگاروں پر لوٹنا، بے دست و پا ہونا، جان چھڑکنا، خاطر میں نہ لانا

۴۔ اپنی کسی پسندیدہ شخصیت کا خاکہ تحریر کیجیے۔

۵۔ سیاق وسباق کے حوالے سے درج ذیل اقتباسات کی تشریح کیجیے:

الف۔ ہم سب کی زندگیوں میں ------------ کوئی ایسا ملے۔

ب۔ ایوب صاحب کا گھر------------ اور نہ شاید آئندہ ہو۔

ج۔ دوستوں میں سے کوئی------------ ہی کلمات کہے۔

د۔ ایوب صاحب کی سیرت و شخصیت--------- لطف وتن دہی سے کرتے تھے۔

۶۔ اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

☆☆☆☆☆

Freebooks.pk

مولانا ظفر علی خاں

(۱۸۷۳ء-۱۹۵۶ء)

حمد

پہنچتا ہے ہر اک مے کش کے آگے دورِ جام اس کا
کسی کو تشنہ لب رکھتا نہیں ہے لطفِ عام اُس کا

گواہی دے رہی ہے اس کی یکتائی پہ ذات اس کی
دوئی کے نقش سب جھوٹے، ہے سچا ایک نام اُس کا

ہر اک ذرّہ فضا کا داستاں اس کی سُناتا ہے
ہر اک جھونکا ہوا کا آکے دیتا ہے پیام اُس کا

سراپا مَعصِیَت میں ہوں، سراپا مغفرت وہ ہے
خطا کوشی روش میری، خطا پوشی ہے کام اس کا

مری افتادگی بھی میرے حق میں اس کی رحمت تھی
کہ گرتے گرتے بھی میں نے لیا دامن ہے تھام اُس کا

ہوئی ختم اس کی حجت اس زمیں کے بسنے والوں پر
کہ پہنچایا ہے اِن سب تک محمدؐ نے کلام اُس کا

بجھاتے ہی رہے پھونکوں سے کافر اس کو رہ رہ کر
مگر نور اپنی ساعت پر، رہا ہو کر تمام اُس کا

(حبسیات)

سوالات

۱۔ شاعر نے ''حمد'' میں باری تعالٰی کی کون کون سی صفات بیان کی ہیں؟

۲۔ مندرجہ ذیل تراکیب کے معنی لکھیے:

دورِ جام، لطفِ عام، تشنہ لب، خطا کوشی، خطاپوشی۔

۳۔ مندرجہ ذیل الفاظ کا تلفّظ اعراب کی مدد سے واضح کیجیے:

تشنہ، معصیت، روش، محبت، ساعت، تحمل

۴۔ اس شعر کی تشریح اپنے استاد کی مدد سے خطبہ حجۃ الوداع کے حوالے سے کیجیے۔

ہوئی ختم اس کی حجت اس زمیں کے بسنے والوں پر
کہ پہنچایا ہے ان سب تک محمدؐ نے کلام اس کا

۵۔ اس حمد کے قوافی اور ردیف کی نشان دہی کیجیے۔

☆☆☆☆☆

حفیظ تائب

(۱۹۳۱ء۔۲۰۰۴ء)

نعت

خوش خصال و خوش خیال و خوش خبر، خیرالبشرؐ
خوش نژاد و خوش نہاد و خوش نظر، خیرالبشرؐ

دل نواز و دل پذیر و دل نشین و دل کشا
چارہ ساز و چارہ کار و چارہ گر، خیرالبشرؐ

سر بہ سر مہر و مُروّت ، سر بہ سر صدق و صفا
سر بہ سر لطف و عنایت ، سر بہ سر، خیرالبشرؐ

صاحبِ خُلقِ عظیم و صاحبِ لطفِ عمیم
صاحبِ حق ، صاحبِ شقُ القمر، خیرالبشرؐ

کار زارِ دہر میں وجہِ ظفر ، وجہِ سکوں
عرصۂ محشر میں وجہِ درگزر، خیرالبشرؐ

رُو نما کب ہو گا راہِ زیست پر منزل کا چاند
ختم کب ہو گا اندھیروں کا سفر، خیرالبشرؐ

کب ملے گا ملّتِ بیضا کو پھر اوجِ کمال
کب شبِ حالات کی ہو گی سَحر، خیرالبشرؐ

در پہ پہنچے کس طرح وہ بے نوا، بے بال و پر
اِک نظر تائبؔ کے حالِ زار پر، خیرالبشرؐ

(از۔۔صلّوا علیہ وآلہٖ)

سوالات

۱۔ حفیظ تائب کے کسی مجموعے میں سے ایک اور نعت لے کر اپنی کاپی میں لکھیے۔

۲۔ اس نعت میں قافیے اور ردیف کی نشاندہی کیجیے۔

۳۔ خوش خصال، خوش خیال، خوش خبر، خوش نژاد، خوش نہاد اور خوش نظر میں "خوش" سابقہ ہے۔ آپ مندرجہ ذیل سابقوں سے پانچ پانچ لفظ بنائیے:

دل، چارہ، سر، صاحب، وجہ، بے

۴۔ "صاحبِ حق، صاحبِ شق القمر، خیرالبشرؐ"

اس مصرعے میں شاعر نے کس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے؟

۵۔ درج ذیل تراکیب کے معنی لکھیے:

مہر و مروّت، صدق و صفا، لطف و عنایت، خلقِ عظیم، لطفِ عمیم، صاحبِ حق، کارزارِ دہر، وجہِ ظفر، وجہِ سکوں، وجہِ درگزر، راہِ زیست، ملّتِ بیضا، اوجِ کمال، شبِ حالات، حالِ زار

۶۔ درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے:

- کارزارِ دہر میں وجہِ ظفر، وجہِ سکوں
  عرصۂ محشر میں وجہِ درگزر، خیرالبشرؐ

- رُو نما کب ہو گا راہِ زیست پر منزل کا چاند
  ختم کب ہو گا اندھیروں کا سفر، خیرالبشرؐ

- کب ملے گا ملّتِ بیضا کو پھر اوجِ کمال
  کب شبِ حالات کی ہو گی سحر، خیرالبشرؐ

۷۔ نظم کے آخری شعر میں شاعر نے کیا دعا مانگی ہے؟

☆☆☆☆☆

Freebooks.pk

اکبر الٰہ آبادی

(۱۸۴۶ء۔۱۹۲۱ء)

خدا سر سبز رکھے اس چمن کو، مہرباں ہو کر

بہار آئی کھلے گل زیبِ صحنِ بوستاں ہو کر
عنادِل نے مچائی دھوم سر گرمِ فغاں ہو کر

بچھا فرشِ زمرّد اہتمامِ سبزۂ تر میں
چلی مستانہ وش بادِ صبا عنبر فشاں ہو کر

عروجِ نشّۂ نشوونما سے ڈالیاں جھومیں
ترانے گائے مرغانِ چمن نے شادماں ہو کر

بلائیں شاخِ گل کی لیں نسیمِ صبح گاہی نے
ہوئیں کلیاں شگفتہ روئے رنگین بتاں ہو کر

کیا پھولوں نے شبنم سے وضو صحنِ گلستاں میں
صدائے نغمۂ بلبل اٹھی بانگِ اذاں ہو کر

ہوائے شوق میں شاخیں جھکیں خالق کے سجدے کو
ہوئی تسبیح میں مصروف ہر پتّی زباں ہو کر

زبانِ برگِ گل نے کی دعا رنگیں عبارت میں
خدا سر سبز رکھے اس چمن کو مہرباں ہو کر

(کلیاتِ اکبر)

سوالات

۱۔ اکبر الٰہ آبادی نے اس نظم میں فصل بہار کے مختلف مناظر کی تصویر کشی کی ہے۔ ان میں سے چند مناظر کی کیفیت کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۲۔ درجِ ذیل تراکیب کے معنی لکھیے:

سرگرمِ فُغاں، فرشِ زمُرّد، مستانہ وَش، بادِ صبا، عنبر فشاں، مرغانِ چمن، بانگِ اذاں، برگِ گل، ہوائے شوق، زیبِ صحنِ بُوستاں،

۳۔ مندرجہ ذیل میں سے ہر ایک کے چار چار ہم قافیہ الفاظ لکھیے:

چمن، گلستان، صبا، بہار

۴۔ اس نظم کے آخری تین شعروں کی نثر بنائیے۔

۵۔ جزو "الف" میں کچھ ایسے الفاظ دیے گئے ہیں جن کے متضاد جزو "ب" میں موجود ہیں۔ آپ ان کے جوڑے لکھیے۔

(الف) بہار، کِھلنا، گُل، پھول، دُعا۔

(ب) خار، کانٹا، بددعا، مرجھانا، خزاں

۶۔ نظم کے آخری شعر میں "زبانِ برگِ گل" نے کیا دعا کی ہے؟

☆☆☆☆☆

Freebooks.pk

مولانا الطاف حسین حالیؔ   ایک ہی موضوع پر جو جبر مسلسل لکھی جاتی ہے نظم کہلاتی ہے

(۱۸۳۷ء۔۱۹۱۴ء)

اسلامی مساوات

کسی قوم کا جب اُلٹتا ہے دفتر
تو ہوتے ہیں مسخ اُن میں پہلے تونگر
کمال اُن میں رہتے ہیں باقی، نہ جوہر
نہ عقل اُن کی ہادی، نہ دین اُن کا رہبر
نہ دنیا میں ذلّت نہ عزت کی پروا
نہ عقبیٰ میں دوزخ نہ جنت کی پروا

نہ مظلوم کی آہ و زاری سے ڈرنا
نہ مفلوک کے حال پر رحم کرنا
ہوا و ہوس میں خودی سے گزرنا
تعیُّش میں جینا، نمائش پہ مرنا
سدا خوابِ غفلت میں بے ہوش رہنا
دمِ نزع تک خود فراموش رہنا

پریشان اگر قحط سے اِک جہاں ہے
تو بے فکر ہیں کیونکہ گھر میں سماں[1] ہے
اگر باغِ اُمّت میں فصلِ خزاں ہے
تو خوش ہیں کہ اپنا چمن گل فشاں ہے
بنی نوع انساں کا حق اُن پہ کیا ہے
وہ اِک نوع، نوعِ بشر سے جُدا ہے

[1] شاعر نے شعری ضرورت کے تحت لفظ سامان کو ''سماں'' لکھا ہے۔

Freebooks.pk

کہاں بندگانِ ذلیل[1] اور کہاں وہ
بسر کرتے ہیں بے غمِ قوت و ناں وہ
پہنتے نہیں جز سمور و کتاں وہ
مکاں رکھتے ہیں رشکِ خُلدِ جناں وہ

(برفانی جانوروں کی کھال کا لباس) (ہمیشہ رہنے والی جنت)

نہیں چلتے وہ بے سواری قدم بھر
نہیں رہتے بے نغمہ و ساز دم بھر

کمر بستہ ہیں لوگ خدمت میں اُن کی
گل و لالہ رہتے ہیں صُحبت میں اُن کی
نفاست بھری ہے طبیعت میں اُن کی
نزاکت ، سو داخل ہے عادت میں اُن کی

دواؤں میں مُشک اُن کی اُٹھتا ہے ڈھیروں
وہ پوشاک میں عِطر ملتے ہیں سیروں

یہ ہو سکتے ہیں اُن کے ہم جنس کیوں کر
نہیں چین جن کو زمانے سے دم بھر
سواری کو گھوڑا نہ خدمت کو نوکر
نہ رہنے کو گھر اور نہ سونے کو بستر
پہننے کو کپڑا نہ کھانے کو روٹی
جو تدبیر اُلٹی تو تقدیر کھوٹی

1 ''ذلیل'' بمعنی ادنیٰ طبقہ، عام لوگ

Freebooks.pk

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ[1] خدا کا
وہی دوست ہے خالقِ دوسرا کا
خلائق سے ہے جس کو رشتہ وِلا کا
یہی ہے عبادت، یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

(مسدسِ حالی)

[1] یہاں اس حدیث کا مفہوم ادا کیا گیا ہے۔

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ

یعنی ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ کے نزدیک وہی سب سے زیادہ محبوب ہے جو اس کے کنبے سے حسنِ سلوک سے پیش آتا ہے۔

Freebooks.pk

سوالات

۱۔ جب کسی قوم کا بیڑا تباہی کے قریب ہوتا ہے تو سب سے پہلے قوم کے کن افراد میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے؟

۲۔ نظم کے حوالے سے بتائیے کہ قوم کے امیروں میں کون کون سے بگاڑ پیدا ہوتے ہیں؟

۳۔ نظم ''اسلامی مساوات'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۴۔ درج ذیل تراکیب کے معنی لکھیے:

بندگانِ ذلیل، خالقِ دوسَرا، دمِ نزع، فصلِ خزاں، کتابِ ہدیٰ، گل فشاں، گل ولالہ، ہواوہوس

۵۔ درج ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے۔

دفتر الٹنا، خودی سے گزرنا، بے ہوش رہنا، کمربستہ ہونا، تدبیر الٹنا، تقدیر کھوٹی ہونا۔

۶۔ نظم ''اسلامی مساوات'' کا دوبارہ مطالعہ کیجیے اور کالم ''الف'' اور کالم ''ب'' سے چُن کر مترادف الفاظ کے جوڑے بنائیے اور صحیح جواب کالم ''ج'' میں لکھیے۔

الف	ب	ج
کمال	ہوس	
ہادی	خودفراموش	
آہ	نال	
ہوا	جوہر	
بے ہوش	رہبر	
قُوت	زاری	

۷۔ نظم ''اسلامی مساوات'' کے پہلے اور آخری بند کی تشریح کیجیے۔

۸۔ اگر کوئی نظم چھے چھے مصرعوں کے بندوں پر مشتمل ہو تو اسے ''مسدس'' کہتے ہیں۔ ''اسلامی مُساوات'' کی ہیئت ''مسدس'' ہے اور یہ مولانا حالی کی شہرہ آفاق طویل نظم ''مدوجزرِ اسلام'' (مسدّسِ حالی) سے اقتباس ہے۔ آپ لائبریری سے علامہ اقبال کی کتاب ''بانگِ درا'' لیجیے اور دیکھیے کہ اُن کی نظموں ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' کی ہیئت کیا ہے اور پھر ان دونوں نظموں کے آخری بند اپنی کاپی میں درج کیجیے۔

☆☆☆☆☆

جوش ملیح آبادی

(۱۸۹۶ء۔۱۹۸۲ء)

سُراغِ راہرو

جہاں زمیں پہ رگڑ کا نشاں ہویدا ہے
دلیل اس کی ہے سانپ اس طرف سے گزرا ہے

نشاں ہلال نُما راہ میں بتاتے ہیں
کہ تھوڑی دور پہ آگے سوار جاتے ہیں

غبارِ راہ نشاں ہے کسی تگ و پو کا
یقین ہوتا ہے نقشِ قدم سے رہرو کا

صنم تراش نہ ہو تو صنم نہیں بنتا
قدم نہ ہو تو نشانِ قدم نہیں بنتا

یونہی یہ راہ کہ ہے جس کا نام کاہ کشاں
یونہی یہ نقشِ قدم ماہ و نیرِ تاباں

یونہی یہ گردِ سرِ راہ خوش نما تارے
رواں ہیں جن کی جبینوں سے حُسن کے دھارے

زمیں کا نور ہیں اور آسماں کی زینت ہیں
کسی کی شوخیٔ رفتار کی علامت ہیں

(سرود وخروش)

Freebooks.pk

سوالات

۱۔ مختصر جواب دیجیے:

(الف) دیہات میں کسی کچے راستے پر صبح کے وقت رگڑ کا نشان دیکھ کر کیا گمان گزرتا ہے؟

(ب) "نشانِ ہلال نما" سے کیا مراد ہے؟ ان سے کس قسم کے سواروں کا تعلق ہے؟

(ج) غبارِ راہ سے تگ و پو کا کیا تعلق ہے؟

(د) آسمان پر کاہ کشاں اور ستارے کس امر کی دلیل ہیں؟

۲۔ درج ذیل تراکیب کے معنی لکھیے:

غبارِ راہ، تگ و پو، نقشِ قدم، نیرِّ تاباں، سرِ راہ، شوخیٔ رفتار

۳۔ اس نظم کا مرکزی خیال بیان کیجیے جو چار پانچ سطروں سے زیادہ نہ ہو۔

۴۔ کالم الف اور کالم ب میں دیے گئے الفاظ میں مطابقت پیدا کر کے جواب کالم ج میں لکھیے:

	کالم (الف)	کالم (ب)	کالم (ج)
(i)	رگڑ کا نشاں	تگ و پو	ـ
(ii)	نشانِ ہلال نما	حسن کے دھارے	ـ
(iii)	غبارِ راہ	سانپ	ـ
(iv)	نقشِ قدم	راہرو	ـ
(v)	تارے	سوار	ـ
(vi)	راہ	کاہ کشاں	ـ

۵۔ اس نظم کے آخری تین شعروں کی تشریح کیجیے۔

☆☆☆☆☆

Freebooks.pk

سید ضمیر جعفری

(۱۹۱۸ء۔۱۹۹۹ء)

آدمی

تھا کبھی علم آدمی ، دل آدمی ، پیار آدمی
آج کل زر آدمی ، قصر آدمی ، کار آدمی

کلبلاتی بستیاں ، مشکل سے دوچار آدمی
کتنا کم یاب آدمی ہے ، کتنا بسیار آدمی

پتلی گردن ، پتلے ابرو ، پتلے لب ، پتلی کمر
جتنا بیمار آدمی ، اتنا طرح دار آدمی

زندگی نیچے کہیں منہ دیکھتی ہی رہ گئی
کتنا اونچا لے گیا جینے کا معیار آدمی

عمر بھر صحرا نوردی کی ، مگر شادی نہ کی
قیس دیوانہ بھی تھا ، کتنا سمجھ دار آدمی

دانش و حکمت کی ساری روشنی کے باوجود
کم ہی ملتا ہے زمانے میں کم آزار آدمی

دل رہینِ صَوْمَعہ ، دستار رہنِ میکدہ
تھا ضمیر جعفری بھی اک مزے دار آدمی

پہلے کشتی ڈوب جاتی تھی نظر کے سامنے
اب گرے گا بحرِ اوقیانوس کے پار[1] آدمی

(نشاطِ تمنا)

---

[1] مراد ہے امریکہ

سوالات

۱۔ سیّد ضمیر جعفری نے نظم کے پہلے شعر میں ماضی اور حال کے آدمی کا کس طرح موازنہ کیا ہے؟ وضاحت کریں۔

۲۔ نظم کے دوسرے شعر میں شاعر کا کہنا ہے کہ کُلبلاتی اور گھنی بستیوں میں مشکل سے دو چار آدمی ہی ملتے ہیں۔ اس سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

۳۔ اس شعر کی تشریح کیجیے:

زندگی نیچے کہیں منہ دیکھتی ہی رہ گئی
کتنا اونچا لے گیا جینے کا معیار آدمی

۴۔ اگرچہ اس نظم کے بیشتر اشعار ظریفانہ ہیں لیکن شاعر نے اس نظم میں بڑی سنجیدگی سے انسانوں کے اخلاقی زوال پر غم اور تشویش کا اظہار بھی کیا ہے۔ آپ اپنی رائے کو چار پانچ سطروں میں لکھیے۔

۵۔ خالی جگہوں پر مناسب الفاظ لگا کر مصرعے مکمل کیجیے۔

(الف) کتنا کم یاب آدمی ہے، کتنا---------- آدمی (مکّار، بیمار، بسیار)

(ب) جتنا------------ آدمی، اتنا طرحدار آدمی (بیمار، موٹا، ٹھگنا)

(ج) کتنا-------- لے گیا، جینے کا معیار آدمی (نیچا، اونچا، سستا)

(د) تھا ضمیرِ جعفری بھی اک- ---------- آدمی (رسیلا، چلبلا، مزے دار)

۶۔ شاعر نے اس شعر میں کیا بات کہنے کی کوشش کی ہے؟

پہلے کشتی ڈوب جاتی تھی نظر کے سامنے
اب گرے گا بحرِ اوقیانوس کے پار آدمی

☆☆☆☆☆

أسرار الحق مجاز

(۱۹۱۰ء۔۱۹۵۶ء)

نوجوان سے خطاب

جلالِ آتش و برق و سحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اُٹھے، وہ شباب پیدا کر

صدائے تیشۂ مزدور ہے ترا نغمہ
تو سنگ و خشت سے چنگ و رُباب پیدا کر

ترے قدم پہ نظر آئے محفلِ انجُم
وہ بانکپن، وہ اَچھوتا شباب پیدا کر

ترا شباب امانت ہے ساری دنیا کی
تو خارزارِ جہاں میں گُلاب پیدا کر

سکون خواب ہے بے دست و پا ضعیفی کا
تو اِضطِراب ہے خود اضطراب پیدا کر

بہے زمیں پہ جو تیرا لہو تو غم مت کر
اسی زمیں سے مہکتے گلاب پیدا کر

(آہنگ)

Freebooks.pk

سوالات

۱۔ ''اجل بھی کانپ اٹھے، وہ شباب پیدا کر'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

۲۔ ''صدائے تیشۂ مزدور'' کا مفہوم دو سطروں میں بیان کیجیے۔

۳۔ درج ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

سنگ و خشت، چنگ و رباب، محفلِ انجم، خارزارِ جہاں، بے دست و پا

۴۔ درج ذیل کا درست تلفظ اعراب کے ذریعے واضح کیجیے:

برق و سحاب، چنگ و رباب، انجم، اضطراب۔

۵۔

ترا شباب امانت ہے ساری دنیا کی
تو خارزارِ جہاں میں گلاب پیدا کر

اس شعر میں شاعر نے نوجوانوں کو بہت پاکیزہ اور تعمیری مشورہ دیا ہے۔ اس کی وضاحت کیجیے جو تین چار سطروں پر مشتمل ہو۔

۶۔ ''نوجوانوں سے خطاب'' میں شاعر کیا پیغام دیتا ہے؟

۷۔ اس نظم میں شاعر نے انقلاب کے حوالے سے کیا کیا باتیں کی ہیں؟ انھیں اپنے الفاظ میں لکھیے۔

☆☆☆☆☆

مجید امجد
(۱۹۱۴ء-۱۹۷۴ء)

ایک کوہستانی سفر کے دوران میں

تنگ پگڈنڈی، سرِ کہسار بل کھاتی ہوئی
نیچے ، دونوں سمت ، گہرے غار منہ کھولے ہوئے
آگے ، ڈھلوانوں کے پار ، اک تیز موڑ ، اور اس جگہ
اک فرشتے کی طرح نورانی پر تولے ہوئے
جھک پڑا ہے آ کے رستے پر کوئی نخلِ بلند
تھام کر جس کو ، گزر جاتے ہیں آسانی کے ساتھ
موڑ پر سے ڈگمگاتے رہروؤں کے قافلے
ایک بوسیدہ، خمیدہ پیڑ کا کمزور ہاتھ
سیکڑوں گرتے ہوؤں کی دستگیری کا امیں
آہ! ان گردن فرازانِ جہاں کی زندگی
اک جھکی ٹہنی کا منصب بھی جنھیں حاصل نہیں!!

(لوحِ دل)

Freebooks.pk

سوالات

۱۔ ''ایک کوہستانی سفر کے دوران میں'' میں جو تمثیل بیان ہوئی ہے اسے اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۲۔ اس نظم کا مرکزی خیال لکھیے جو چار پانچ سطروں سے زیادہ نہ ہو۔

۳۔ الفاظ کے متضاد لکھیے:

تنگ، نیچے، آگے، پار، تیز، فرشتہ، بلند، آسان، فراز، زندگی

۴۔ درج ذیل کا تلفظ اعراب کے ذریعے واضح کیجیے:

سمت، کہسار، خمیدہ، منصب، نخلِ بلند

۵۔ درج ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے:

بَل کھانا، منہ کھولنا، پر تولنا، جھک پڑنا، ڈگمگا جانا، دستگیری کرنا۔

☆☆☆☆☆

Freebooks.pk

احسان دانش

(۱۹۱۴ء۔۱۹۸۲ء)

تغیّر

اے ہم نشیں! کلام برا لا کلام ہے
سُن! زندگی تغیّرِ پیہم کا نام ہے

راتوں کو ہے سَحَر کی تجلّی کا انتظار
ہے ہر صدا فراقِ خموشی میں بے قرار

سوئے خزاں، بہارِ گلستاں روانہ ہے
ہر برگ کا سکوت سراپا فسانہ ہے

نکہت کی کوششیں کہ نکلنا نصیب ہو
موسم کو یہ لگن کہ بدلنا نصیب ہو

شمس و قمر کو ضد ہے کہ گرمِ سفر رہیں
بے رنگیوں میں خالقِ شام و سحر رہیں

شہروں میں انقلاب، بیاباں میں انقلاب
محفل میں انقلاب، شبستاں میں انقلاب

کس پر یہاں تغیّرِ نو کا فسوں نہیں
اس بزم میں نصیب کسی کو سکوں نہیں

(نفیرِ فطرت)

Freebooks.pk

سوالات

۱۔ مختصر جواب دیجیے:

(الف) احسان دانش نے زندگی کو کس چیز سے تعبیر کیا ہے؟

(ب) رات کے سماں کو کس کا انتظار رہتا ہے؟

(ج) ہر صدا کس کے فراق میں بے قرار رہتی ہے؟

(د) بہارِ گلستاں کس جانب روانہ رہتی ہے؟

(ہ) نکہت کی کیا کوشش ہوتی ہے؟

(و) موسم کو ہر آن کیا لگن رہتی ہے؟

(ز) شمس و قمر کس بات پر بضد رہتے ہیں؟

۲۔ مناسب الفاظ کی مدد سے مصرعے مکمل کیجیے:

(الف) راتوں کو ہے---------- کا انتظار

(ب) ہے ہر صدا---------- میں بے قرار

(ج) سوئے خزاں---------- روانہ ہے

(د) شمس و قمر کو ہے ضد کہ ------ رہیں

۳۔ مندرجہ ذیل الفاظ کا تلفظ اعراب کی مدد سے واضح کریں۔

تغیر، سحر، نکہت، تجلی، فسوں، بزم

۴۔ اس نظم میں مندرجہ ذیل مرکبات استعمال ہوئے ہیں آپ مزید پانچ مرکبات لکھیے:

فراقِ خموشی، سوئے خزاں، بہارِ گلستاں، گرمِ سفر، خالقِ شام و سحر

۵۔ کالم الف اور کالم ب میں سے چن کر متضاد الفاظ کے جوڑے بنایئے اور صحیح جواب کالم ج میں لکھیے:

کالم (الف)	کالم (ب)	کالم (ج)
تغیر	حضر	
فراق	وصل	
خزاں	ثبات	
سفر	شام	
سحر	بہار	

۶۔ اس شعر کی تشریح کیجیے:

کس پر یہاں تغیرِ نو کا فُسوں نہیں
اس بزم میں نصیب کسی کو سکوں نہیں

۷۔ اس نظم کا مرکزی خیال لکھیے جو چار پانچ سطروں سے زیادہ نہ ہو۔

۸۔ علامہ اقبال کے اس شعر کے مفہوم کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تغیر کے موضوع پر ایک مضمون لکھیے۔

سکوں محال ہے قدرت کے کار خانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

انور مسعود

(ولادت: ۱۹۳۵ء)

قطعات

جو چوٹ بھی لگی ہے وہ پہلی سے بڑھ کے تھی
ہر ضربِ کربناک پہ میں تلملِا اُٹھا
پانی کا ، سوئی گیس کا ، بجلی کا ، فون کا
بل اتنے مل گئے ہیں کہ میں بلبلِا اُٹھا

☆ ☆ ☆

تمھاری بھینس کیسے ہے کہ جب لاٹھی ہماری ہے
اب اس لاٹھی کی زد میں جو بھی آئے سو ہمارا ہے
مذمت کاریوں سے تم ہمارا کیا بگاڑو گے؟
تمھارے ووٹ کیا ہوتے ہیں جب ویٹو[1] ہمارا ہے

☆ ☆ ☆

اُجڑا سا وہ نگر کہ ہڑپا ہے جس کا نام
اُس قریۂ شکستہ و شہرِ خراب سے
عبرت کی اک چھٹانک برآمد نہ ہو سکی
کلچر نکل پڑا ہے منوں کے حساب سے

☆ ☆ ☆

کلرکوں سے آگے بھی افسر ہیں کتنے
جو بے انتہا صاحبِ غور بھی ہیں
ابھی چند میزوں سے گزری ہے فائل
''مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں''

(قطعہ کلامی)

---

1. VETO: اقوام متحدہ میں سلامتی کونسل کے مستقل ارکان کا حق، جس کے تحت کسی قرارداد کو مسترد کیا جا سکتا ہے۔

Freebooks.pk

سوالات

۱۔ شاعر نے پہلے قطعے میں کس معاشرتی مسئلے کی نشاندہی کی ہے؟

۲۔ دوسرے قطعے میں شاعر نے طنز و مزاح کے انداز میں کس عالمی مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے؟

۳۔ دوسرا قطعہ پڑھتے ہی ذہن میں کون سی معروف ضرب المثل آتی ہے اور اس کا مفہوم کیا ہے؟

۴۔ اپنے استاد سے معلوم کیجیے کہ ہڑپا کے کھنڈرات پنجاب میں کہاں واقع ہیں اور ان سے عبرت کا کون سا پہلو نکلتا ہے؟

۵۔ شاعر نے چوتھے قطعے میں ہمارے دفتری نظام کا کون سا المیہ بیان کیا ہے؟

۶۔ مندرجہ ذیل تراکیب کے معنی لکھیے:

ضربِ کربناک، قریۂ شکستہ، شہرِ خراب، صاحبِ غور، مذمت کاری، مقاماتِ آہ وفغاں

۷۔ اپنے استاد سے معلوم کیجیے کہ چوتھے قطعے کے آخری مصرعے کو واوین میں کیوں لکھا گیا ہے؟ اصطلاح میں اسے کیا کہتے ہیں؟

۸۔ قطعہ ایسی صنفِ نظم ہے جس میں کم از کم دو شعر ہوتے ہیں جن میں دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتا ہے اور ہر قطعے میں الگ مفہوم ادا کیا جاتا ہے۔ آپ اپنی لائبریری سے انور مسعود کا کوئی سا مجموعہ کلام حاصل کیجیے اور اس میں سے اپنی پسند کے مزید چار قطعات اپنی کاپی میں لکھیے۔

☆☆☆☆☆

Freebooks.pk

خواجہ میر دردؔ

(۱۷۱۹ء-۱۷۸۵ء)

(۱)

کام مَردوں کے جو ہیں ، سو وہی کر جاتے ہیں
جان سے اپنی جو کوئی کہ گزر جاتے ہیں

موت! کیا آ کے فقیروں سے تجھے لینا ہے
مرنے سے آگے ہی ، یہ لوگ تو مر جاتے ہیں

دید وادید جو ہو جائے، غنیمت سمجھو
جوں شرر ورنہ ہم اے اہلِ نظر جاتے ہیں

بے ہنر ، دشمنِ اہلِ ہنر ہے ، آ کر
منہ پہ چڑھتے تو ہیں ، پر جی سے اُتر جاتے ہیں

ہم کسی راہ سے واقف نہیں ، جوں نورِ نظر
رہنما تو ہی تو ہوتا ہے ، جدھر جاتے ہیں

آہ! معلوم نہیں ، ساتھ سے اپنے شب و روز
لوگ جاتے ہیں چلے ، سو یہ کدھر جاتے ہیں

تا قیامت نہیں مٹنے کا دلِ عالم سے
دردؔ ہم اپنے عوض چھوڑے اثر جاتے ہیں

(۲)

کیا فرق داغ و گل میں کہ جس گل میں بو نہ ہو
کِس کام کا وہ دل ہے کہ جس دل میں تُو نہ ہو

ہووے نہ حَول و قُوّت[۱] اگر تیری درمیاں
جو ہم سے ہو سکے ہے، سو ہم سے کبھُو نہ ہو

جو کچھ کہ ہم نے کی ہے تمنا، ملی مگر
یہ آرزو رہی ہے کہ کچھ آرزو نہ ہو

جوں شمع جمع ہوویں گر اہلِ زباں ہزار
آپس میں چاہیے کہ کبھی گفتگو نہ ہو

جوں صُبح، چاکِ سینہ مرا، اے رفو گراں!
یاں تو کِسو کے ہاتھ سے ہرگز رفو نہ ہو

اے دردؔ زنگ صورت اگر اس میں جا کرے
اہلِ صفا میں آئینۂ دل کو رُو نہ ہو

(دیوانِ دردؔ)

---

۱ طاقت اور قدرت (لا حول و لا قوة الا بالله العلی العظیم) کا مخفف یعنی کسی میں نہ گناہ سے بچنے کی طاقت ہے نہ کوئی نیکی کرنے کی قوت حاصل ہے سوائے خدائے بزرگ و برتر کے جو سب سے بلند اور مرتبے والا ہے۔

سوالات

۱۔ خواجہ میر درد ایک باعمل صوفی اور اخلاقی اقدار کے علم بردار شاعر ہیں۔ بتائیے انھوں نے پہلی غزل کے مطلع میں مردانہ وار کام کسے قرار دیا ہے؟

۲۔ میر درد نے پہلی غزل کے دوسرے شعر میں فقیروں کی یہ خصوصیت بیان کی ہے کہ یہ لوگ تو مرنے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔ اس کا مفہوم کیا ہے؟

۳۔ پہلی غزل کے چوتھے شعر کے حوالے سے بتائیے کہ بے ہنر جی سے کیسے اتر جاتے ہیں؟

۴۔ خواجہ میر درد نے دوسری غزل کے مطلع میں دل کے لیے لازمی چیز کیا قرار دی ہے؟

۵۔ شاعر نے دوسری غزل کے دوسرے شعر میں خدا سے مخاطب ہو کر کس بات کو تسلیم کیا ہے؟

۶۔ پہلی غزل کے تیسرے اور دوسری غزل کے چوتھے اور پانچویں شعر میں تشبیہ کی نشاندہی کیجیے؟

۷۔ درج ذیل تراکیب کے معنی لکھیے:

دیدوادید، اہلِ نظر، دلِ عالم، داغ وگل، حَول وقُوّت، چاکِ سینہ، اہلِ صفا، آئینۂ دل

۸۔ مندرجہ ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے:

جان سے گزر جانا، منہ پہ چڑھنا، جی سے اتر جانا

۹۔ مندرجہ ذیل کا تلفظ اعراب لگا کر واضح کیجیے:

دیدوادید، غنیمت، واقف، عوض، دل عالم، حول وقوت، صبح

۱۰۔ خواجہ میر درد کی غزلوں کے مندرجہ ذیل شعروں کی تشریح کیجیے:

بے ہنر ، دشمنِ اہلِ ہنر سے ، آ کر
مُنہ پہ چڑھتے تو ہیں ، پر جی سے اتر جاتے ہیں
کیا فرق داغ و گُل میں کہ جس گُل میں بُو نہ ہو
کس کام کا وہ دل ہے کہ جس دل میں تُو نہ ہو
ہووے نہ حَول و قوت اگر تیری درمیاں
جو ہم سے ہو سکے ہے ، سو ہم سے کبھو نہ ہو

☆☆☆☆☆

شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ

(۱۷۵۱ء - ۱۸۲۴ء)

(۱)

دنیا میں جب تلک کہ میں اندوہ گیں رہا
غم دل سے اور دل سے میرے غم ، قریں رہا

رونے سے کام بس کہ شب اے ہم نشیں رہا
آنکھوں پہ کھنچتا میں، سرِ آستیں رہا

نازک مزاج تھا میں بہت اس چمن کے بیچ
جب تک رہا تو خندۂ گل سے حزیں رہا

ہمدم جو دیکھتا ہوں تو پہلو میں دل نہیں
بیٹھا تھا اس کے پاس ، مرا دل وہیں رہا

آخر کو ہو کے لالہ اُگا نوبہار میں
خونِ شہیدِ عشق نہ زیرِ زمیں رہا

دی جان ایسے ہوش سے اپنی کہ خلق کو
جینے کا میرے تا دمِ آخر یقیں رہا

یاران گرم رَو تو سب آگے نکل گئے
ان سے میں تنگِ قافلہ پیچھے کہیں رہا

رکھوں میں روک کیوں کے دل اپنے کو مصحفیؔ
میرے کہے میں اب تو مرا دل نہیں رہا

(۲)

جہاں ہیں سب مر گئے ہیں

نہ گیا کوئی عدم کو دلِ شاداں لے کر
یاں سے کیا کیا نہ گئے حسرت و ارماں لے کر

باغ وہ دشتِ جنوں تھا کہ کبھی جس میں سے
لالہ و گل گئے ثابت نہ گریباں لے کر

پردۂ خاک میں سو ، سو رہے جا کر افسوس
پردہ رخسار پہ کیا کیا مہِ تاباں لے کر

ابر کی طرح سے کر دیویں گے عالم کو نہال
ہم جدھر جاویں گے، یہ دیدۂ گریاں لے کر

پھر گئی سوئے اسیرانِ قفس بادِ صبا
خبرِ آمدِ ایامِ بہاراں لے کر

تنہائی — بادشاہ

مصحفی گوشۂ عزلت کو سمجھ تختِ شہی
کیا کرے گا تو عبث ملکِ سلیمان[۱] لے کر

بے کار (فضول)

(دیوانِ مصحفی)

۱۔ حضرت داؤدؑ کے بیٹے اور بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر و بادشاہ۔ روایت ہے کہ تمام حیوانات اور جن و انس ان کے تابع تھے۔

سوالات

۱۔ مصحفی کی دونوں غزلوں میں قافیے اور ردیف کی نشاندہی کیجیے۔

۲۔ چند جملوں میں وضاحت کیجیے:

(الف) دنیا میں اندوہ گیں رہنے کا مفہوم کیا ہے؟

(ب) چمن میں خندۂ گل سے حزیں رہنے سے کیا مراد ہے؟

(ج) خونِ شہیدِ عشق آخر کس رنگ میں ظاہر ہوا؟

(د) خلق کو تا دمِ آخر مرنے کا یقین کیوں نہ آیا؟

(ہ) قافلے میں کون آگے نکل گیا اور کون پیچھے رہا؟

(و) شاعر کے خیال میں لالہ و گل کے گریباں ثابت کیوں نہیں ہیں؟

(ز) مہِ تاباں کے زیرِ زمیں چلے جانے سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

(ح) شاعر نے گوشۂ عزلت کو تختِ شہی پر کیوں ترجیح دی ہے؟

۳۔ درج ذیل تراکیب کے معنی لکھیے:

اندوہ گیں، سرِ آستیں، خندۂ گل، زیرِ زمیں، تا دمِ آخر، تنگِ قافلہ، دلِ شاداں، پردۂ خاک، مہِ تاباں، دیدۂ گریاں، اسیرانِ قفس، گوشۂ عزلت، تختِ شہی

۴۔ شاعر نے دوسری غزل میں دیدۂ گریاں کو ابر سے تشبیہ دی ہے۔ بتائیے کہ ان میں وجہِ شبہ کیا ہے؟

۵۔ آپ تلمیح کی تعریف پڑھ چکے ہیں۔ بتائیے کہ دوسری غزل کے مقطعے میں کون سی تلمیح آئی ہے اور اس کے پس منظر میں کیا روایت ہے؟

۶۔ مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کی تذکیر و تانیث واضح ہو جائے:

دنیا، غم، مزاج، چمن، خلق، قافلہ، گریباں، بادِ صبا، آمد، گوشۂ عزلت

۷۔ مصحفی کی پہلی غزل کے درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے:

آخر کو ہو کے لالہ اُگا نوبہار میں
خونِ شہیدِ عشق نہ زیرِ زمیں رہا

- دی جاں ایسے ہوش سے اپنی کہ خلق کو
  جینے کا میرے تا دمِ آخر یقیں رہا
- یارانِ گرم رو تو سب آگے نکل گئے
  ان سے میں ننگِ قافلہ پیچھے کہیں رہا

۸۔ مصحفی کی دوسری غزل کے مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کیجیے:

- پردۂ خاک میں سو، سو رہے جا کر افسوس
  پردۂ رخسار پہ کیا کیا مہِ تاباں لے کر
- ابر کی طرح سے کر دیویں گے عالَم کو نہال
  ہم جدھر جاویں گے یہ دیدۂ گریاں لے کر
- پھر گئی سوئے اسیرانِ قفس بادِ صبا
  خبرِ آمدِ ایّامِ بہاراں لے کر

☆☆☆☆☆

(۱)

بس کہ دُشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی مُیسّر نہیں انساں ہونا

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مُجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنّا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عُریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تُو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا

عشرتِ پارۂ دل ، زخمِ تمنّا کھانا
لذّتِ ریشِ جگر ، غرقِ نمکداں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حَیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت ، غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

Freebooks.pk

(۲)

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سر گراں کیوں ہو

کیا غم خوار نے رُسوا، لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی، وہ میرا راز داں کیوں ہو

یہ کہہ سکتے ہو، ہم دل میں نہیں ہیں، پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمھیں تم ہو، تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدُو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ
ترِے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو؟

(دیوانِ غالبؔ)

Freebooks.pk

سوالات

۱۔ مرزا غالب کی دونوں غزلوں میں مطلع اور مقطعے کی نشان دہی کیجیے۔

۲۔ پہلی غزل کے دوسرے شعر میں مرزا غالب کس بات پر حیرانی کا اظہار کر رہے ہیں؟

۳۔ پہلی غزل کے تیسرے شعر میں اہلِ تمنا کو شمشیرِ عریاں ہلالِ عید کیوں نظر آتی ہے؟

۴۔ دوسری غزل کے مطلع میں مرزا غالب زبان پر کوئی حرفِ شکایت لانا پسند نہیں کرتے۔ اس کا کیا مفہوم ہے؟

۵۔ دوسری غزل کے دوسرے شعر میں مرزا غالب اپنی وضع داری پر قائم رہنا چاہتے ہیں۔ اس سے کیا مراد ہے؟

۶۔ غزل علائم و رموز کی زبان ہے یعنی شاعر کچھ علامتوں اور اشاروں کنایوں میں اپنی دلی کیفیات کا اظہار نہایت لطیف پیرائے میں کرتا ہے۔ دوسری غزل کے پانچویں شعر کے حوالے سے بتائیے کہ ''آسمان'' کس بات کی علامت ہے؟

۷۔ مندرجہ ذیل تراکیب کے معنی لکھیے:

دیوانگیٔ شوق، اہلِ تمنا، زود پشیماں، پارۂ دل، بہ صد رنگ، عیدِ نظّارہ

۸۔ مندرجہ ذیل مصرعوں کو اصل لفظ کی مدد سے مکمل کیجیے:

(الف) آدمی کو بھی میسّر نہیں-------- ہونا

(ب) نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں ----- کیوں ہو

۹۔ مرزا غالب کی دونوں غزلوں کے دوسرے اور چھٹے شعر کی تشریح کیجیے۔

☆☆☆☆☆

علامہ محمد اقبالؒ
(۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء)

(۱)

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اَسرارِ شہنشاہی

عطّار[1] ہو، رومی[2] ہو، رازی[3] ہو، غزالی[4] ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

نومید نہ ہو اِن سے، اے رہبرِ فرزانہ!
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

اے طائرِ لاہُوتی! اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اَولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بُوئے اسدُاللّٰہی

آئینِ جوانمرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رُوباہی

۱۔ پورا نام خواجہ فرید الدّین عطّارؒ ہے۔ چھٹی صدی ہجری کے نصف اوّل میں نیشاپور (ایران) میں پیدا ہوئے۔ فارسی کے مشہور صوفی اور شاعر تھے۔

۲۔ رومی سے مراد ہے مولانا رومؒ (جلال الدّین محمد ۱۲۰۷ء-۱۲۷۳ء) بلخ میں پیدا ہوئے اور روم (ترکی) کے شہر قونیہ میں فوت ہوئے۔ علامہ اقبال خود کو مولانا رومؒ کا معنوی شاگرد کہتے تھے اور کلام الٰہی اور حدیث شریف کے بعد مثنوی مولانا رومؒ سے استفادہ کرتے تھے۔

۳۔ شیخ فخر الدین رازیؒ (۵۴۴ھ-۶۰۶ھ) رَے (ایران) میں پیدا ہوئے۔ تفسیر اور منطق و فلسفہ کے استادِ کامل اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔

۴۔ امام غزالیؒ (۴۵۰ھ-۵۰۵ھ) طوس (ایران) میں پیدا ہوئے۔ فلسفہ و حکمت کے استادِ کامل تھے۔ اسلامی تعلیمات کی غیر فانی کتابوں "احیاء العلوم" اور "کیمیائے سعادت" کے علاوہ ستر سے زیادہ کتب تصنیف کیں۔

Freebooks.pk

(۲)

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لا اِلٰہ میں ہے

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

مہ و ستارہ سے آگے مُقام ہے جس کا
وہ مُشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہ گزرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا
جہانِ تازہ مری آہِ صبح گاہ میں ہے

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

(بالِ جبریل)

Freebooks.pk

سوالات

۱۔ علامہ اقبالؒ کی پہلی غزل میں کون سے الفاظ قافیے کے طور پر استعمال ہوئے ہیں اور یہ کہ اس غزل میں ردیف کیوں نہیں آئی؟ اپنے استاد سے معلوم کیجیے۔

۲۔ دوسری غزل میں قافیے اور ردیف کی نشاندہی کیجیے۔

۳۔ علامہ اقبالؒ کی پہلی غزل کے مطلع کے حوالے سے بتائیے کہ وہ کون سا جذبہ ہے جو غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی کھول دیتا ہے؟ تاریخ کے اوراق سے کوئی مثال دیجیے۔

۴۔ پہلی غزل کے دوسرے شعر کے حوالے سے چند سطروں میں واضح کیجیے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک ''آہِ سحر گاہی'' کی کیا اہمیت ہے؟

۵۔ علامہ اقبالؒ نے پہلی غزل کے چوتھے شعر میں ''طائرِ لاہوتی'' کی اصطلاح کس کے لیے استعمال کی ہے، اس کا مفہوم کیا ہے؟

۶۔ ''بوئے اسداللّٰہی'' سے کیا مراد ہے؟ ایک مردِ فقیر یہ خوبی اختیار کر کے دارا وسکندر پر کیسے فوقیت حاصل کر لیتا ہے؟

۷۔ پہلی غزل کے آخری شعر کے حوالے سے بتائیے:

(الف) جواں مردوں کا آئین کیا ہے؟

(ب) اللہ کے شیر کون ہوتے ہیں؟

۸۔ علامہ اقبالؒ کی دوسری غزل کے دوسرے شعر کے حوالے سے بتائیے کہ ''لا الہ'' میں کون سا نکتہ پوشیدہ ہے؟

۹۔ دوسری غزل کے چوتھے شعر کے حوالے سے بتائیے کہ وہ کون لوگ ہیں جن کا مُقام مہ وستارہ سے آگے ہے؟

۱۰۔ دوسری غزل کے پانچویں شعر کے حوالے سے بتائیے ''خدایانِ بحر و بر'' سے کیا مراد ہے؟

۱۱۔ مندرجہ ذیل تراکیب کے معنی لکھیے:

آدابِ خود آگاہی، سحر گاہی، رہبر فرزانہ، کم کوش، طائرِ لاہوتی، آئینِ جواں مرداں، مردِ قلندر، سنگ وخشت، مشتِ خاک، سیلِ بے پناہ

۱۲۔ درج ذیل کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کی تذکیر و تانیث واضح ہو جائے:

رزق، پرواز، آئین، بارگاہ، نکتہ، مقام، مشتِ خاک

۱۳۔ علامہ اقبال کی پہلی غزل کے آخری تین شعروں کی تشریح کیجیے۔

☆☆☆☆☆

ناصر کاظمی

(۱۹۲۵ء-۱۹۷۲ء)

(۱)

دل میں اِک لہر سی اُٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

تو شریکِ سخن نہیں ہے تو کیا
ہم سخن تیری خامشی ہے ابھی

یاد کے بے نشاں جزیروں سے
تیری آواز آ رہی ہے ابھی

شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

وقت اچھا بھی آئے گا ناصرؔ
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

Freebooks.pk

(۲)

اے ہم سخن وفا کا تقاضا ہے اب یہی
میں اپنے ہاتھ کاٹ لوں، تو اپنے ہونٹ سی

کن بے دلوں میں پھینک دیا حادثات نے
آنکھوں میں جن کی نور نہ باتوں میں تازگی

بول اے مرے دیار کی سوئی ہوئی زمیں
میں جن کو ڈھونڈتا ہوں کہاں ہیں وہ آدمی

میٹھے تھے جن کے پھل، وہ شجر کٹ کٹا گئے
ٹھنڈی تھی جس کی چھاؤں وہ دیوار گر گئی

بازار بند، راستے سنسان، بے چراغ
وہ رات ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں کوئی

ناصؔر بہت سی خواہشیں دل میں ہیں بے قرار
لیکن کہاں سے لاؤں، وہ بے فکر زندگی

(دیوان)

Freebooks.pk

سوالات

۱۔ چند جملوں میں وضاحت کیجیے:

(الف) دل میں اک لہر سی اٹھنے کا مفہوم کیا ہے؟

(ب) خانۂ دل میں کیسا شور برپا ہے؟

(د) خامشی ہم سخن کیسے بنتی ہے؟

(ہ) شاعر نے ماضی کی یادوں کو بے نشاں جزیرے کیوں کہا ہے؟

(و) زندگی شہر کی بے چراغ گلیوں میں کیا ڈھونڈتی ہے؟

(ز) شاعر کے نزدیک وفا کا تقاضا کیا ہے؟

(ح) حادثات نے شاعر کو کیسے لوگوں کے درمیان لا پھینکا ہے؟

۲۔ ناصر کاظمی کی دوسری غزل میں ردیف نہیں ہے محض قافیہ ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ شعر کے لیے ردیف ضروری نہیں البتہ قافیے کا ہونا ضروری ہے۔ آپ اپنی کتاب کے حصہ غزل میں کوئی اور ایسی غزل تلاش کیجیے جس میں ردیف نہ آئی ہو؟

۳۔ ناصر کاظمی کے ہاں شجر اور دیوار کے الفاظ بطور استعارہ کس کے لیے استعمال ہوئے ہیں؟

۴۔ ناصر کاظمی کی پہلی غزل کے پہلے دو شعروں میں جو تشبیہات استعمال ہوئی ہیں، اُن کی وضاحت کیجیے۔

۵۔ درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے:

۔ بول اے میرے دیار کی سوئی ہوئی زمیں
میں جن کو ڈھونڈتا ہوں کہاں ہیں وہ آدمی

۔ میٹھے تھے جن کے پھل، وہ شجر کٹ کٹا گئے
ٹھنڈی تھی جس کی چھاؤں وہ دیوار گر گئی

۔ بازار بند، راستے سنسان، بے چراغ
وہ رات ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں کوئی

☆☆☆☆☆

Freebooks.pk

فراقؔ گورکھپوری

(۱۸۹۶ء۔۱۹۸۲ء)

اُداسی ، بے دلی ، آشفتہ حالی میں کمی کب تھی
ہماری زندگی یارو ہماری زندگی کب تھی

علائق سے ہوں بیگانہ و لیکن اے دلِ غمگیں
تجھے کچھ یاد تو ہو گا کسی سے دوستی کب تھی

حیاتِ چندروزہ بھی حیاتِ جاوداں نکلی
جو کام آئی جہاں کے وہ متاعِ عارضی کب تھی

یہ دنیا کوئی پلٹا لینے ہی والی ہے اب شاید
حیاتِ بے سکوں کے سر میں یہ شوریدگی کب تھی

مرے نغموں نے اے دنیائے غم چمکا دیا تجھ کو
ترے ظلمت کدے میں زندگی کی روشنی کب تھی

فراقؔ اب اتفاقاتِ زمانہ کو بھی کیا کہیے
محبت کرنے والوں سے کسی کو دشمنی کب تھی

(شعلۂ ساز)

سوالات

۱۔ فراقؔ گورکھپوری کی غزل میں قافیہ اور ردیف کی نشاندہی کیجیے۔

۲۔ فراقؔ کی غزل کے تیسرے اور چوتھے شعر کی تشریح کیجیے۔

۳۔ فراقؔ نے غزل میں اتفاقاتِ زمانہ کو کس بات کا موجب قرار دیا ہے؟ آپ کس حد تک اس سے متفق یا غیر متفق ہیں؟ بحث کیجیے۔

۴۔ مندرجہ ذیل تراکیب کے معنی لکھیے:

آشفتہ حالی، دلِ غمگین، حیاتِ چندروزہ، حیاتِ جاوداں، متاعِ عارضی، حیاتِ بے سکوں، دنیائے غم، اتفاقاتِ زمانہ، ظلمت کدہ

۵۔ اس غزل میں سے محاورے تلاش کیجیے اور انھیں جملوں میں استعمال کیجیے۔

☆☆☆☆☆☆

تابش دہلوی
(۱۹۱۳ء۔۲۰۰۴ء)

سکوں درکار ہے لیکن سکوں حاصل نہیں ہوتا
ذرا جو دل کو ٹھیرا[1] دے وہ دردِ دل نہیں ہوتا

کبھی ہر جلوۂ صد رنگ حاصل تھا نگاہوں کو
اب اشکِ خوں بھی چشمِ شوق کو حاصل نہیں ہوتا

ہر اک کارِ تمنا پر یہ مجبوری، یہ مختاری
مجھے آساں نہیں ہوتا، تجھے مشکل نہیں ہوتا

ہمیں ہنگامہ آرا تھے مگر ہم جب سے ڈوبے ہیں
کہیں طوفاں نہیں اُٹھتا، کہیں ساحل نہیں ہوتا

تماشا سوز ہے ہر جلوۂ اندازِ یکتائی
تمھیں تم ہو، کوئی پردہ بھی اب حائل نہیں ہوتا

رہا اِک اِک قدم پر پاسِ آدابِ طلب ورنہ
وہاں ہم تھے جہاں پانا ترا مشکل نہیں ہوتا

ازل سے اپنا مقصودِ طلب ہے کون اے تابش
کہ پائے جستجو شرمندۂ منزل نہیں ہوتا

(نیمروز)

۱۔ ٹھیرا.........مروّجہ املا 'ٹھہرا' ہے۔

سوالات

۱۔ تابش کی اس غزل کے دوسرے اور آخری شعر کی تشریح کیجیے۔

۲۔ غزل کے چوتھے شعر میں تابش کس بات کا دعویٰ کر رہے ہیں؟ آپ کس حد تک متفق یا غیر متفق ہیں؟ بحث کیجیے۔

۳۔ غزل میں کچھ الفاظ و تراکیب ایک دوسرے کی متضاد کے طور پر آئے ہیں۔ آپ انھیں تلاش کر کے لکھیے۔

۴۔ مندرجہ ذیل مرکبات کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کے معنی واضح ہو جائیں۔

کارِ تمنا، تماشا سوز، ہنگامہ آرا، چشمِ شوق، آدابِ طلب، پائے جستجو، شرمندۂ منزل، اشکِ خوں

۵۔ مندرجہ ذیل مصرعوں کو اصل لفظ کی مدد سے مکمل کیجیے:

الف۔ ہر اک کارِ تمنا پر یہ مجبوری، یہ ....

ب۔ ....ہم تھے جہاں پانا ترا مشکل نہیں ہوتا

ج۔ تمھیں تم ہو، کوئی ....بھی اب حائل نہیں ہوتا

د۔ کبھی ہر جلوۂ صد رنگ ....تھا نگاہوں کو

☆☆☆☆☆

فرہنگ

نوٹ: فرہنگ میں الفاظ کے بالعموم وہی معنی دیے گئے ہیں جو متن سے مطابقت رکھتے ہیں۔

ا۔ مناقبِ عمر بن عبدالعزیزؒ

استیصال : جڑ سے اکھیڑنا
بدعت : دین میں نئی بات پیدا کرنا
جھلا کر : غصے میں آ کر
راست باز : سچا
زعم : گمان، ظن، خیال
قلم انداز کرنا : لکھنے میں چھوڑ جانا
لحظہ : لمحہ، پل، دم
متدیّن : مومن، دین دار، معاملہ اور بات کا سچا
مسند : تخت
مناقب : منقبت کی جمع، ہنر، تعریف، بڑائی

۲۔ تشکیلِ پاکستان

احیا : زندہ کرنا، زندگی بخشنا
اظہر من الشمس : سورج سے زیادہ نمایاں، بہت واضح
اکارت : ناکارہ، بے سود، بے فائدہ
انحطاط : زوال، کمی
بروئے کار آنا : کام میں آنا
بُرہان : قطعی دلیل، جس میں کوئی شبہ نہ ہو
بیگانگی : بے تعلقی، پرایا پن
پراگندہ : منتشر، پریشان، متفکر
پرتو فگن : روشنی دینے والا، شعاع ڈالنے والا
تخریب : خراب کرنا، بگاڑنا، تعمیر کا متضاد
جبروت : عظمت، جلال
چرخ : آسمان
حصے بخرے کرنا : حصے تقسیم کرنا، آپس میں بانٹنا
سطوت : رعب، شان و شوکت
سنگھٹن : مسلمانوں کو ختم کرنے کی ہندوؤں کی ایک تحریک کا نام
شدھی : ہندوؤں کی ایک تحریک کا نام جو انھوں نے مسلمانوں کو ہندو بنانے کے لیے شروع کی تھی۔
علم الکلام : مذہبی امور کو عقلی دلائل سے ثابت کرنے کا علم
غائر : گہرا، وسیع
مذموم : بُرا، خراب، قابلِ مذمت
مساعی : مسعات کی جمع، کوشش، جدوجہد
مُصلح : اصلاح کرنے والا
مُناقشات : مُناقشہ کی جمع، جھگڑے، لڑائیاں
منجملہ : سب میں سے، تمام میں سے
ناگفتہ بہ : جن کا ذکر نہ کرنا بہتر ہے
نیابتِ الٰہی : اللہ تعالیٰ کا نائب ہونا
نیلی فام : نیل گوں، نیلے رنگ کا
ہیٹے رہنا : کم پڑنا، پست ہمت ہونا، کم درجے کا ہونا

۳۔ نواب محسن الملک

پارس : ایک خاص پتھر، جس کی نسبت روایت ہے کہ جو اگر لوہے سے چھو جائے اس کو سونا کر دے۔
جاہ و ثروت : شان و شوکت، منصب و دولت
رسا : کسی چیز تک پہنچنے والا
زیر بار : بوجھ تلے دبا ہوا
قلم فرسائی : لکھنے کی زحمت
مُنغّض : افسردہ اور ناراض
مُکدّر : ناخوش، ملول
مہر آمیز : محبت بھرا
میلاد : پیدائش
نہج : طور، طریقہ، ڈھنگ
وجاہت : خوب صورتی، رعب، دبدبہ

۴۔ محنت پسند خردمند

احتیاج : حاجت، ضرورت
پیراہن : لباس
تونگری : امیری، دولت مندی
خدائی : دنیا جہان، مخلوق خدا
خردمند : عقل مند، دانا
خسروِ آرام : آرام کا بادشاہ

Freebooks.pk

ڈالی : ٹوکری جس میں میوے رکھ کر حکام کو پیش کرتے ہیں۔
ذُرّیات : جمع ذُرّیّت کی، اولاد، نسل
ریلا : دھکا، سیلاب، متحرک ہجوم
زمزمہ : نغمہ، ترنّم، گیت
شمیم : خوش بودار ہوا
شوریّت : کھاری پن، بنجر پن
غول : گروہ، انبوہ، مجمع
کلیل کرنا : چوپایوں کا خوشی سے اچھلنا کودنا
مُدام : ہمیشہ، سدا، متواتر
مفرح : فرحت بخش، خوشی دینے والا
مقوی : قوت بخش، طاقت دینے والا
یک قلم : بالکل، تمام، یک لخت

۵۔ اکبری کی حماقتیں

آنکنا : قیمت لگانا، جانچنا
اجلوانا : جلا دینا، چمکانا، میل کچیل دور کرنا
التفات : توجہ
بالفعل : اس وقت، موجودہ حالت میں، سرِ دست
بالی پتے : پتوں کی شکل کے جڑاؤ آویزے جو کان کی بالیوں میں لٹکاتے ہیں۔
باؤلی : پاگل، دیوانی
بغارے : بڑے بڑے چھید، شگاف
پٹوا : زری باف، وہ شخص جو مالا یا تسبیح یا زیور میں ڈوری ڈالتا ہے۔
چندے آفتاب، چندے ماہتاب : حسن و جمال میں سورج اور چاند جیسا ہونا
دھگدگی : گلے کا ایک زیور جو سینے سے اوپر لٹکا رہتا ہے۔
زمزمی : آبِ زم زم رکھنے کا چھوٹا برتن
عقیق البحر : سرخ رنگ کا قیمتی پتھر جو سمندر سے نکلتا ہے، مونگا
کٹڑوا : زمین کا چھوٹا سا آباد قطعہ
کٹنی : مکار عورت، ٹھگ عورت، جھانسا دینے والی عورت
کلابتو : سونے یا چاندی کے تاروں کی ڈور
کلاوہ : کچا سوت، کچا دھاگا
گنڈا : دھاگا جس پر منتر یا کوئی عمل پڑھ کر گرہ دیتے جاتے ہیں۔
لال : ایک چھوٹا سا خوش آواز پرندہ
لوٹ ہو جانا : ریجھ جانا، تڑپ جانا، بے قرار ہو جانا

ناخدا : ملاح، کشتی چلانے والا
نادِ علیؓ : حضرت علیؓ سے منسوب ایک خاص دعا جو کسی چیز پر لکھ کر بچے کے گلے میں ڈالتے ہیں۔
نالکی : ایک قسم کی کھلی پالکی جس میں امیر عورتیں سوار ہوتی ہیں۔
ہڑ : ایک قسم کی لمبی گھنڈی جو ہڑ سے مشابہ ہوتی ہے اور گوٹے کے ہاروں اور ازار بند میں لگائی جاتی ہے۔

۶۔ پہلی فتح

بدک کر : دل برداشتہ ہو کر، بھڑک کر
پیش قدمی : بڑھ کر حملہ کرنا، سبقت لے جانا
تقلید : پیروی، نقل
خود اعتمادی : اپنے آپ پر اعتماد ہونا، اپنی صلاحیتوں کا احساس ہونا
دور افتادہ : جو دور ہو، فاصلے پر واقع ہو
سامانِ رسد : فوج کے لیے اناج، کھانے کا سامان
شب خون : رات کو بے خبری میں دشمن پر حملہ کرنا
غیور : بہت غیرت والا
متقاضی : تقاضا کرنے والا، مانگنے والا
مجلسِ شوریٰ : جس مجلس سے مشورہ کیا جائے، مجلسِ مشاورت
مستقر : ٹھہرنے کی جگہ، ٹھکانا
معمّر : بوڑھا، بڑی عمر کا
ہراول : دستہ جو فوج کے آگے چلے

۷۔ دستک

پُر اسرار : بھید سے بھرپور
ٹکٹکی باندھنا : غور سے دیکھنا، بغیر پلک جھپکے دیکھنا
دستک : دروازہ کھٹکھٹانا
شب بخیر : رات خیر سے گزرے، رات کو رخصت ہونے کا سلام
نقاہت : کمزوری، ناطاقتی، ناتوانی

۸۔ ہوائی

اختراع : نئی چیز کی دریافت، ایجاد، جدت
الامان : خدا کی پناہ
بساطی : چھوٹی چھوٹی متفرق اشیا بیچنے والا
تنوع : قسم قسم کا، رنگا رنگ
توسّل : وسیلہ، ذریعہ
ٹھیکی لگانا : بوجھ سر سے اتار کر آرام لینا، چلتے چلتے تھک کر دم لینا

Freebooks.pk

دیرینہ : پرانا، قدیم

ذخار : کوئی چیز جمع کرنا، ذخیرہ کی جمع

رین بسیرا : رات رہنا، شب بسری کرنا

عمیق : گہرا

قصہ کوتاہ : الغرض، مختصر یہ کہ

کسرِ شان : وہ بات جس سے کسی کی عزت و آبرو میں فرق آئے

گرہستن : سگھڑ، سلیقے والی

مراجعت : واپسی

ناگفتہ بہ : اس کا نہ کہنا بہتر ہے

ہمہ گوں : تمام قسم کا

۹۔ مولانا ظفر علی خاں

اژدر : اژدہا، بہت بڑا اور موٹا سانپ

افسر الملک : حیدر آباد (دکن) کی فوج کا ایک عہدہ، بڑا افسر

برسبیلِ تذکرہ : تذکرے کے طور پر

برق ہونا : تیز ہونا، چالاک ہونا

پنڈ چھوڑنا : پیچھا چھوڑنا

چنداں : قدرے، تھوڑا سا

دام : جال، پھندا

ڈنڑ پیلنا : ورزش کرنا، (ڈنڑ کی ورزش کرنا)

راقم : لکھنے والا، کاتب

زلفِ عنبر بار : خوش بودار زلف، عنبر کی خوش بو بکھیرے والی زلف

شانہ : کندھا

صُبحِ کاذب : صبح کی روشنی جس کے بعد پھر اندھیرا چھا جاتا ہے۔

صیغہ : محکمہ، شعبہ، سررشتہ

عمامہ : پگڑی، دستار

عنقا : ایک فرضی پرندہ کنایۃً نایاب اور نادر الوجود چیز

غائب غلّہ : بالکل غائب

غُل غپاڑا : بے حد شور غل، ہنگامہ

غلغلہ : شور غوغا، دھوم، آوازہ، شہرہ

فکاہات : فکاہت کی جمع، خوش طبعی، زندہ دلی

قبہ شکم : پیٹ کا گنبد، موٹا پیٹ

کژدم : بچھو، عقرب

گرانڈیل : بھاری اور بڑے جسم والا

گلوری : پان کا بیڑا

مراسلہ : خط، چٹھی

مُسہل : وہ دوا جس سے دست آئیں، جلاب

مضمحل : کمزور، تھکا ہوا

مطب : دواخانہ، کلینک

مُگدر : وہ بھاری لکڑی جو ورزش کے لیے ہاتھ سے اٹھاتے ہیں جس کے عین درمیان میں موٹھ لگی ہوتی ہے۔

نیم باز آنکھیں : ادھ کھلی آنکھیں

ہمسری : ہم رتبہ، برابری

۱۰۔ قُرطبہ کا قاضی

استہزا : ہنسی اڑانا

اضطرار : بے اختیاری، بے قراری، پریشانی

ایوان : دیوان خانہ، نشست گاہ

بدفال : بُرا شگون لینے والا

تأسّف : افسوس، پچھتاوا، پشیمانی

حجتی : جھگڑالو، تکرار کرنے والا

دار : سُولی

دریچہ : کھڑکی، چھوٹا دروازہ

دلدوز : دل میں گھس جانے والی، دردناک

سجیلا : بنا ٹھنا، خوش وضع، خوبصورت

سروکار : تعلق، واسطہ، لگاؤ

ششدر : حیران پریشان

عفو : معافی، بخشش، درگزر

کُوڑھ مغز : بے وقوف، کند ذہن

کوسِ رحلت : کوچ کا نقارہ

گریہ و بکا : رونا پیٹنا، آہ وزاری

ناظرِ عدالت : عدالت کے کارندے، عدالتی امور کی دیکھ بھال کے ذمہ دار

نشتر زبان : بدزبان

ہم نسب : ایک ہی نسل والے

۱۱۔ مواصلات کے جدید ذرائع

ارتعاش : کانپنا، حرکت پذیر ہونا

امتزاج : ملانا، آمیزش کرنا

بِکنسہ : ہو بہو، من وعن

بصری اشارے : ایسے اشارے جن کا تعلق دیکھنے سے ہے۔

Freebooks.pk

بلادِ اسلامیہ : مسلمانوں کے شہر و ممالک
صوتی اشارے : ایسے اشارے جن کا تعلق آواز سے ہے۔
عوامل : کارکن
مواصلات : پیغام رسانی

۱۲۔ مولوی نذیر احمد دہلوی

اُپلوں کی ڈنڈی: اُپلوں کی ٹال
اشرفی : سونے کا سکہ
باؤلی : وہ بڑا کنواں جس میں پانی بھرنے یا لینے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوتی ہیں تاکہ مسافر بغیر رسی ڈول کے نیچے اتر کر پانی لے سکیں۔
باک : ڈر، خوف، اندیشہ
بساط : حیثیت، حوصلہ، قدرت، طاقت
پس و پیش کرنا : سوچ بچار کرنا، ٹال مٹول کرنا
پیش دالان : برآمدہ، اگلا دالان، چھوٹا صحن
توشۂ آخرت : نیک اعمال جو آخرت میں کام آئیں، عاقبت کا سامان
جید عالم : بہت بڑا عالم، زبردست عالم
خویش : خود آپ، رشتے دار، داماد
دامے درمے
قدمے سخنے : ہر طرح کی مدد کرنے کو تیار (روپے پیسے سے، عملی طور پر اور زبان سے)
ردّ و قدح : بحث و تکرار، حُجت
رام کرنا : مطیع کرنا، بس میں کرنا
شُستہ و رفتہ : پاک صاف، سلیس، رواں
علی الصباح : صبح سویرے، نور کے تڑکے
غبن : خورد بُرد، خیانت
کنٹوپ : سردیوں میں پہننے کی روئی والی بڑی ٹوپی، ٹوپ جس سے کان ڈھانپ لیں۔
کھنڈلا : ٹوٹا پھوٹا مکان، جھونپڑا
گٹا : وہ نشان جو بہت زیادہ سجدے کرنے سے پڑ جاتا ہے۔
لیتڑا : ٹوٹا ہوا جوتا
محاسب : حساب کتاب کرنے والا، پڑتال کرنے والا، آڈیٹر
مُرفّہ الحال : خوش حال، آسودہ، دولت مند
کھاری باؤلی : پرانی دلّی کے ایک قدیم علاقے کا نام
ہلکانا : لٹکانا، پھنسانا، الجھانا

۱۳۔ ایک سفرنامہ جو کہیں کا بھی نہیں ہے

آثار صنادید : پرانے تاریخی آثار
پالان : وہ گدّی جو لادو جانوروں کی کمر پر بچاؤ کے لیے ڈالتے ہیں
پاوندے : افغانستان کے خانہ بدوش قبائل کے افراد
تعویق : دیر، تاخیر
تن زیب کا انگرکھا: بہت باریک کپڑے کا چغا، قبا
جوئے کم آب : ایسی ندی جس میں پانی کم ہو
چین و ماچین : چین اور چین سے آگے
خشمگیں : غضب ناک
دگلا : چغا جس میں روئی بھری ہو
دیدہ زیب : خوبصورت
زیر جامہ : وہ لباس جو پوشاک کے نیچے پہنا جاتا ہے
فرسنگ : فاصلے کا ایک ماپ جو اٹھارہ ہزار فٹ ہوتا ہے
کانگڑی : مٹی کی انگیٹھی جس کے اوپر تیلیوں کا غلاف چڑھا ہوتا ہے۔ کشمیریوں میں اس کا استعمال عام ہے۔
کُلہ (کلاہ) : لمبی ٹوپی
کماحقہٗ : جیسا اس کا حق ہے، ٹھیک ٹھیک
گئو کُشی : گائے ذبح کرنا
مُتواضع : تواضع کرنے والا، عاجزی کرنے والا
مطبع : چھاپہ خانہ، پرنٹنگ پریس
نظر بٹو : ایسی بدشکل چیز یا کالا نشان جو خوبصورت چیزوں کو نظر بد سے بچانے کے لیے لگاتے ہیں۔

۱۴۔ ایوب عباسی

استبداد : ظلم و ستم
التفات : توجہ
بدہیئتی : بدصورتی
بزعمِ خود : اپنے خیال میں
بھشتی : پانی بھرنے یا پلانے والا
بھلمنساہٹ : انسانیت، شرافت
خود سپاری : اپنے آپ کو دوسروں کے لیے وقف کر دینا
خیر اندیش : بھلا سوچنے والا
دنایت : نالائقی، کمینہ پن

Freebooks.pk

ردّوقدح : عیب چینی کرنا، بحث وتکرار، حُجّت
رعنا : خوش نما، خوب صورت
شقاوت : بدبختی، بے رحمی، بدانجامی
قضیہ : جھگڑا، فساد
ملگجی : مٹی کا رنگ، غبار آلود
نحیف الجثّہ : کمزور جسامت کا
نعائمِ فطرت : نعامہ کی جمع ہے، قدرت کی نعمتیں

حصّہ نظم

۱۔حمد

اُفتادگی : گرنا، بے بسی، عاجزی
تحمّل : برداشت، بُردباری
تشنہ لَب : پیاسا
حُجّت : دلیل
خطاپوشی : قصور پر پردہ ڈالنا، غلطی چھپانا
خطاکوشی : قصور کرنا، غلطی کرنا
دورِجام : جام (ساغر) کا ہر ایک کے سامنے باری باری آنا
دُوئی : دو ہونے کی کیفیت، توحید کی ضد، شرک
ذُوالجلال : جلال والا، بزرگی اور عظمت والا، اللہ تعالیٰ
ساعت : وقت، گھڑی
مَعصِیت : گناہ، قصور
مَغفرت : بخشش، نجات، معافی
مے کش : مے خوار، شراب (شرابِ معرفت) پینے والا
یکتائی : اکیلا ہونا، بے مثال ہونا

۲۔نعت

اوجِ کمال : کمال کی بلندی
بے بال وپر : بے یارومددگار، بے سروسامان محتاج، ناتواں، عاجز
چارہ ساز : کام بنانے والا، کام درست کرنے والا
چارہ گر : مُعالج، طبیب
خوش خِصال : اچھی عادات والا، نیک خصلت
خوش نژاد : اعلیٰ خاندان کا حامل، عالی نسب
خوش نہاد : طینت، ہنس مکھ
خیرالبشرؐ : بہترین انسان، پیغمبرؐ کا لقب

راہِ زیست : زندگی کی راہ
سر بہ سر : اِس سرے سے اُس سرے تک، تمام کُل
عرصۂ محشر : میدانِ حشر
شقُّ القمر : حضور اکرمؐ کا معجزہ، جس میں چاند کو دو ٹکڑے کر دیا گیا تھا۔
ظفر : فتح، کامیابی
کارزارِ دہر : زمانے کی جنگ، وقت کا مقابلہ
لُطفِ عمیم : عام مہربانی، لُطفِ عام، عام لطف وکرم
ملّتِ بیضا : روشن ملت، کنایۃً مسلمان قوم
مہرومروّت : محبت، الفت، شفقت

۳۔خدا سرسبز رکھے اس چمن کو مہرباں ہو کر

بانگِ اذاں : اذان کی آواز
برگِ گُل : پھول کی پتی
بلائیں لینا : قربان ہونا، والہانہ محبت کا اظہار کرنا
زیبِ صحنِ بوستاں: چمن کے صحن کی سجاوٹ
سرگرمِ فُغاں ہونا: بلند آواز سے چیخنا چلانا
عنبرفشاں : خوشبو بکھیرنے والا
فرشِ زُمرّد : سبز رنگ کے قیمتی پتھر کا فرش مراد سبز گھاس کا فرش
مُرغانِ چمن : باغ کے پرندے
مستانہ وِش : مستوں کی طرح، متوالوں کی طرح، جھومتے جھامتے
نسیمِ صُبح گاہی : صُبح کے وقت چلنے والی ٹھنڈی ہوا
ہوائے شوق : محبت یا عشق کا نشہ، مستی

۴۔اسلامی مساوات

بندگانِ ذلیل : ادنیٰ درجے کے لوگ
تعیُّش : عیش وعشرت
تونگر : اصل تواں گر ہے، مال دار، دولت مند
جُز : سوا، بغیر
جوہر : خوبی، ہُنر، کمال
خالقِ دوسرا : دونوں جہانوں کا پیدا کرنے والا
خُلدِ جناں : خُلد = ہمیشہ رہنے والی بہشت، جناں = جنت کی جمع، ہمیشہ رہنے والی جنت
دفتر الٹنا : تباہ ہونا، برباد ہونا
دمِ نزع : جان کنی کا وقت، مرنے کے قریب ہونا

سَمُور : برفانی جانوروں کی کھال کا لباس، (سمور دراصل لومڑی کی جسامت کا ایک برفانی جانور ہے جو شمالی برفستانوں میں پایا جاتا ہے)

عُقبیٰ : اگلا جہاں، دوسرا جہاں، آخرت

فصلِ خزاں : خزاں کا موسم، پت جھڑ کا زمانہ

قُوتِ وناں : خوراک اور روٹی

کتابِ ہُدیٰ : ہدایت دینے والی کتاب یعنی قرآن مجید

کتاں : باریک ریشمی کپڑا

کمربستہ : کمر باندھے ہوئے، آمادہ، تیار

گل فشاں : پھول بکھیرنے والا

مَسخ : بگاڑ، اچھی صورت کا بری صورت میں بدل جانا، بگڑا ہوا

مفلوک : تباہ حال، خستہ خراب، مفلس

نوعِ بشر : انسان، مراد ہے عالمِ انسانیت

ولا : الفت، دوستی، محبت

ہادی : ہدایت دینے والا

ہوا و ہوس : حرص، طمع، خواہشِ نفسی

۵۔ سراغِ راہرو

تگ و پو : دوڑ دھوپ، کوشش، جستجو

جبیں : پیشانی

راہرو : راستہ چلنے والا، مسافر

صنم : بت

صنم تراش : بت تراش

کاہکشاں (کہکشاں): بہت سے ستاروں کی قطار یا راستہ جو آسمان پر رات کے وقت نظر آتا ہے۔

نیرِ تاباں : چمکتا سورج

ہلال نما : پہلی رات کے چاند کی طرح

ہویدا : ظاہر، عیاں، واضح

۶۔ آدمی

بسیار : زیادہ، بے انتہا

طرحدار : بانکا، سجیلا، وضع دار

رہن : گروی رکھنا

رہین : جو چیز رہن رکھی جائے

صحرانوردی : صحراؤں یا جنگلوں میں مارے مارے پھرنا

صَومعہ : عیسائیوں کی عبادت گاہ، گرجا، کلیسا

قصر : محل، عالی شان مکان

قیس : عرب کے ایک قبیلے بنو عامر کا ایک شخص جو لیلیٰ کا عاشق تھا۔ (مجنوں)

کلبلاتی بستیاں : مراد ہے گھنی آبادی والی بستیاں

۷۔ نوجوانوں سے خطاب

اجل : موت، قضا

اچھوتا : جسے کسی نے چھوا نہ ہو، انوکھا، نادر

اضطراب : بے تابی، بے قراری

بَرق : آسمانی بجلی

بے دست و پا : بغیر ہاتھ پاؤں کے، عاجز، بے بس

چنگ و رباب : ستار اور سارنگی، موسیقی کے آلات

خارزارِ جہاں : کانٹوں بھری دنیا، مراد ہے ایسی دنیا جہاں مصائب و آلام کا دور دورہ ہو۔

سحاب : بادل

سنگ و خشت : پتھر اور اینٹ

شباب : جوانی

۸۔ ایک کوہستانی سفر کے دوران میں

امین : امانت دار

پر تولنا : پرندے کا اُڑنے پر آمادہ ہونا

خمیدہ پیڑ : جھکا ہوا درخت

دستگیری : کسی کا ہاتھ پکڑ کر اسے سہارا دینا، مدد، حمایت

رہرو : مسافر، راستہ چلنے والا

سرِ کہسار : پہاڑ کی چوٹی پر

سَمت : طرف، جانب، رُخ

گردن فراز : گردن اونچی کرنے والا، متکبر، مغرور

منصب : مرتبہ، عہدہ، درجہ

نخلِ بلند : بلند و بالا درخت، قد آور درخت

۹۔ تغیّر

برگ : پتا

تجلّی : روشنی، چمک، جلوہ

تغیّرِ پیہم : مسلسل انقلاب، لگاتار تبدیلی

Freebooks.pk

فُسوں : اصل افسوں ہے، جادو، سحر

لاکلام : وہ بات جس پر بحث کی گنجائش نہ ہو۔

نکہت : خوشبو، مہک

۱۰۔ قطعات

آہ وفغاں : چیخ پکار، رونا پیٹنا، نالہ وفریاد

بلبلانا : بے تاب ہونا، بے قراری سے رونا، چلّانا

تلملانا : مضطرب ہونا، تڑپنا

شہرِ خراب : اجڑا ہوا شہر، برباد شدہ شہر، کھنڈر

ضربِ کربناک : دردناک چوٹ

قریۂ شکستہ : ٹوٹا پھوٹا گاؤں، ویران گاؤں

مذمّت کاری : برائی کرنا، ہجو کرنا، تحقیر کرنا

غزلیات

۱۔ خواجہ میر درد

اہلِ صفا : صاف باطن لوگ، نیک لوگ۔ مراد صوفیائے کرام

جوں : مانند، مثل (حرفِ تشبیہ)

جان سے گزر جانا: مرجانا، فوت ہوجانا

جی سے اتر جانا : نظروں سے گرجانا، قدر نہ رہنا

حول وقوّت : برائی سے بچنے کی طاقت اور نیکی کی قوت

دیدوادید : دو آدمیوں کا باہمی ملاقات کو جانا، آپس کا ملنا جلنا

رفو : پھٹے ہوئے کپڑے کی مرمت کرنا

رُو : چہرہ، شکل، صورت، یہاں سُرخ روئی (کامیابی) مراد ہے۔

شرر : چنگاری

کبھو : لفظ "کبھی" کی قدیم صورت۔

۲۔ شیخ غلام ہمدانی مُصحفی

اندوہ گیں : غم ناک، رنجیدہ، پریشان

بس کہ : چونکہ، اس لیے کہ

تختِ شہی : بادشاہ کا تخت، مسندِ شاہ

حزیں : غمگین، رنجیدہ، ملول

خندۂ گُل : پھول کی ہنسی، پھول کا کھلنا

دلِ شاداں : خوش و خرّم دل

دیدۂ گریاں : روتی ہوئی آنکھ

قریں : قریب، پاس، نزدیک

گرم رَو : تیز رفتار، تیز رَو

گوشۂ عزلت : گوشۂ تنہائی، خلوت

مہِ تاباں : روشن چاند

۳۔ مرزا غالب

اہلِ تمنّا : اہلِ عشق

بہ صد رنگ : سوسو رنگوں سے، سو سو طرح سے

بے مہر : بے مروّت، بے رحم، بے محبت

پارۂ دل : دل کا ٹکڑا، مراد ہے دل

حیف : افسوس (حرفِ تاسّف)

خو : عادت، خصلت، ڈھنگ، چلن

داغِ تمنائے نشاط: خوشی کی تمنا کا داغ

دیوانگی شوق : جذبۂ جنوں

ریش : زخم

زخمِ تمنا کھانا : ناکامی کی اذیت برداشت کرنا

زود پشیماں : جلد پچھتانے والا

سُبک سر : کمینہ، اوچھا، بے عزت

سرگراں : خفا، ناراض، ناخوش

شمشیر کا عریاں ہونا: تلوار کا نیام سے نکلنا

عدو : دشمن، مخالف

گلستاں ہونا : کنایہ ہے وفورِ شادمانی سے، بے حد خوش ہونا

نوا سنجِ فغاں : فریاد کرنے والا

نہاں : پوشیدہ، چھپا ہوا

وائے : افسوس، ہائے (کلمۂ تاسّف)

وضع : روش، دستور، طور طریق (یہاں بہ معنی خودداری)

۴۔ علامہ محمد اقبالؒ

آوارگانِ راہ : راستے میں بھٹکنے والے لوگ، مراد ہے جدوجہد اور سعی و طلب میں مشغول لوگ

آئین : اصول، دستور، طریقہ

اسد اللّٰہی : خدا کے شیر یعنی حضرت علیؓ سے تعلق رکھنے والی صفت، بہادری، بے خوفی

اسرارِ شہنشاہی : شہنشاہی کے بھید

اَولیٰ : بہت بہتر، نہایت اچھا

Freebooks.pk

بادۂ ناب : خالص شراب

خدایانِ بحروبر : سمندر اور خشکی کا انتظام کرنے والے مراد فرشتے

خلیل : دوست، مراد حضرت ابراہیمؑ

خود آگاہی : اپنے آپ کو پہچاننا

دارا : قدیم فارس (ایران) کے ایک مشہور بادشاہ کا نام جسے سکندر نے شکست دی تھی۔

روباہی : لومڑی کی طرح ہونا، مکروفریب، چالاکی

سحر گاہی : صبح کے وقت کا

سکندر : سکندر جس نے ایران میں دارا اور ہندوستان میں راجا پورس کو شکست دی تھی۔

سیلِ بے پناہ : ایسا سیلاب جس سے بچنے کی جگہ نہ ملے

صبح گاہی : صبح کے وقت کا

کدو : وہ بڑا پیالہ جو گول کدو کے خشک چھلکے سے بنایا جاتا ہے اور پیالے وغیرہ کی جگہ فقرا استعمال کرتے ہیں۔ کوزۂ شراب۔

کم کوش : کوشش میں کمی کرنے والا، سست

لاہوتی : عالمِ الوہیت میں پہنچا ہوا

مردِ قلندر : وہ شخص جو روحانی ترقی یہاں تک کر گیا ہو کہ اپنے وجود اور دنیا کے تمام تعلقات سے بے خبر ہو کر ہمہ تن خدا کی ذات کی طرف متوجہ ہو، خدا تعالیٰ کا فقیر مست

مشتِ خاک : مٹھی بھر خاک، مراد ہے انسان

نومید : ناامید، مایوس

۵۔ ناصر کاظمی

بے چراغ گلیاں : اجاڑ سنسان گلیاں

دیار : ملک، شہر، وطن

شریکِ سخن : بات چیت میں شامل، شاملِ کلام

ہاتھ کاٹ لینا : بے بس ہونا، مجبور ہونا

ہم سخن : ہم زبان، ہم کلام، ساتھی

ہونٹ سینا : چپ ہو جانا، خاموش ہو جانا

۶۔ فراق گھورکھپوری

آشفتہ حالی : پریشان حالی، دیوانگی

شوریدگی : پریشانی، حیرانی، دیوانگیِ عشق

علائق : "علاقہ" کی جمع، تعلقات، روابط

ظلمت کدہ : تاریک مقام، وہ جگہ جہاں اندھیرا چھایا ہوا ہو، دنیا

۷۔ تابش دہلوی

پائے جستجو : وہ پاؤں جو تلاش میں مصروف ہو۔ محنت کرنے والا

تماشا سوز : مشاہدے کو ختم کرنے والا، جس سے کوئی اور چیز نظر نہ آئے

جلوۂ اندازِ یکتائی : مطلب ہے توحید خداوندی کا جلوہ، پوری ترکیب کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کی چکا چوند نے باقی سب مشاہدوں کو گہنا دیا ہے

جلوۂ صد رنگ : سو رنگ کی تجلی، ایسا نور جس کے سیکڑوں زاویے ہوں

چشمِ شوق : عشق و محبت کی آنکھ، وہ آنکھ جس میں کسی کی گہری محبت رچ بس گئی ہو

شرمندۂ منزل : منزل پر پہنچنے والا

کارِ تمنا : خواہش کا مقصود، خواہش کی تکمیل کے لیے کوشش کرنا

ہنگامہ آرا : فتنہ برپا کرنے والا، جنگ پر تیار رہنے والا

☆......☆......☆

Freebooks.pk

کتاب کے مؤلفین اور مدیر کے مختصر کوائف

مولفین:

ڈاکٹر علی محمد خاں

پروفیسر شعبہ اردو، ایف سی کالج لاہور

تعلیمی قابلیت:	ایم۔اے (اردو، تاریخ)، پی ایچ ڈی (اردو)
تدریسی تجربہ:	۴۳ سال
علمی وادبی کام:	۲۷ مطبوعہ کتابیں، متعدد مطبوعہ مضامین
ادارت:	''دبستان'' لاہور (۱۴ سال تک)

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

صدر شعبہ اردو (ر) گورنمنٹ سائنس کالج، وحدت روڈ لاہور

تعلیمی قابلیت:	ایم۔اے (اردو)، پی ایچ ڈی (اردو)
تدریسی تجربہ:	۳۱ سال
علمی وادبی کام:	۱۵ مطبوعہ کتابیں، بیسیوں مطبوعہ مضامین
ادارت:	''اردو ڈائجسٹ'' لاہور، ''زندگی'' لاہور

پروفیسر جعفر بلوچ

صدر شعبہ اردو (ر) گورنمنٹ سائنس کالج، وحدت روڈ لاہور

تعلیمی قابلیت:	ایم۔اے (اردو)، بی ایڈ
تدریسی تجربہ:	۳۷ سال
علمی وادبی کام:	۱۷ مطبوعہ کتابیں
ادارت:	''تھل'' لیہ، ''راوی'' لاہور، ''دبستان'' لاہور

مدیر:

محمد ظفر الحق چشتی

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، گورنمنٹ اسلامیہ کالج، سول لائن، لاہور

تعلیمی قابلیت:	ایم۔اے (اردو)، ایم۔فل (اردو)، پی ایچ ڈی (سکالر) پنجابی فاضل۔ڈپلومہ فارسی زبان وادب
تدریسی تجربہ:	انٹرمیڈیٹ تا ایم اے ۲۵ سال
علمی وادبی کام:	نعتیہ شاعری کی مطبوعہ کتاب، تقریباً ۵۰ مطبوعہ مضامین
ادارت:	''معیار'' فیصل آباد، ''المنہاج'' لاہور، ''کریسنٹ'' لاہور، ''فاران'' لاہور